کچے بول
گیان چند

کچّے بول
گیان چند

چھ سو

انیس سو اکیانوے

پہلی بار

پروڈکشن : مُطرب صحرائی

خوش نویس : محمد عمران اعظمی

طباعت : اے ون آفسیٹ پرنٹرز، کوچہ چیلان، دہلی

ناشر : گیان چند

۹/۲۵، اندرا نگر، لکھنؤ۔۲۲۶۰۱۹

قیمت : ستر روپے

یہ مجموعہ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے شائع ہوا

ترتیب

اعتذار

قدرے معذرت اور ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنا مجموعۂ کلام پیش کر رہا ہوں۔ ۱۴ سال کی عمر میں جب میں نویں درجے کا طالبِ علم تھا، میں نے شاعری شروع کی۔ اس وقت تخلص غافل رکھا جسے بعد میں ترک کر دیا اور دوسرا کوئی تخلص نہ کیا۔ درخواست ہے کہ اب کوئی میرے نام کے ساتھ اس تخلص کا استعمال نہ کرے۔ بعض اشعار کے قافیے میں یہ تخلص بندھ گیا ہے اس لیے اسے باقی رکھنا پڑا ورنہ میں قارئین کو اس کا پتا بھی نہ چلنے دیتا۔ پہلے دور میں شاعری کے باب میں میں نے خاصی پُرگوئی دکھائی۔ ۴۳ء سے ۴۷ء تک تقریباً روزانہ کچھ نہ کچھ کہتا تھا۔ مشہور ہے کہ شاعر کچھ کہتا ہے تو جب تک کسی دوسرے کو نہ سُنا دے اس وقت تک اس کے دل میں ایک گرہ بندھی رہتی ہے۔ میں نے اپنی شاعری کا ۹۵۔۹۰ فی صد حصّہ کبھی کسی کو نہیں سُنایا۔ کہتا تھا اور لکھ کر رکھ دیتا تھا۔ یہ بڑی غلطی تھی۔ اگر دوسروں کو سُناتا اور رسالوں میں شائع کرانے کی کوشش کرتا تو دوسروں کی تنقید اور رسالوں کے ردّ و قبول سے اپنی شاعری کے حُسن و قبح کا اندازہ ہو جاتا اور میں ضروری اصلاح کر لیتا۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟

پہلے دور میں غزلوں سے زیادہ نظمیں کہیں۔ ۴۲ء کے آخر میں جوشؔ کی رباعیوں کا مجموعہ جنون و حکمت پڑھا۔ اس سے متاثر ہو کر سال ڈیڑھ سال میں تقریباً پانسو رُباعیات کہہ دیں۔ ۴۷ء کے وسط میں طالبِ علمانہ زندگی ختم کر کے میں تین سال بے روزگار رہا۔

۱۹۴۸ء کے ختم ہوتے ہوتے مَیں نے شاعری تقریباً ترک کردی۔ ۱۹ سال کے جمود کے بعد دوسرا دَور ۱۹۶۷ء سے شروع ہوتا ہے جس میں طویل وقفے کے بعد کوئی غزل کہہ لیتا ہوں نظموں کے موضوع ذہن میں گھومتے ہیں لیکن ذہنی یکسوئی نہ ہونے کے سبب نظم نہیں کہہ پاتا۔ تحقیق کی فکر آشوبیوں کے سبب شاعری کا دماغ نہیں رہا۔ ایک وقت میں ایک ہی کام کرپاتا ہوں۔ لگن کے ساتھ شاعری بھی کرسکتا ہوں جب تحقیق کاری سے فراغت پاؤں۔

جس زمانے میں یہ شعر کہے تھے اگر اسی وقت انھیں شائع کردیتا تو مجھے معلوم ہوجاتا کہ مَیں کتنے پانی میں ہُوں۔ ہم عصروں کی تنقید سے مجھے رہبری ہوتی۔ مَیں سب سے زیادہ اقبال سے متاثر ہوا۔ ابتدائی جماعتوں میں اقبال کا "بانگِ درا" کا کلام پڑھ کر اس کی تقلید کی، گویا ۱۹۴۸ء کے لگ بھگ مَیں نے بیسویں صدی کے اوائل جیسی شاعری کی اور اسے شائع کرنے کا ارادہ کررہا ہوں بیسویں صدی کے اواخر میں یعنی اس شاعری کا بڑا حصّہ پَون صدی پہلے کے موضوعات پر ہے۔ مَیں نے اس کا انتخاب کیا۔ ۱۹۴۸ء تک کا سرمایہ کوئی ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ اس میں سے تقریباً ایک چوتھائی لیا ہوگا اور وہ بھی اصلاح و ترمیم کے بعد۔ ۱۹۵۱ء کے بعد کی شاعری کا تقریباً تمام حصّہ برقرار رکھا جب اسے ترتیب دینے کا خیال آیا تو مَیں نے حیدرآباد میں ڈاکٹر مغنی تبسّم کو دیکھنے کے لیے دیا کہ انتخاب کردیں۔ انھوں نے مسودہ ایک سال تک اپنے پاس ڈالے رکھا اور مروّت کے سبب کہہ دیا کہ پورے کا پورا شائع کردیا جائے۔ مجھے اس سے اطمینان نہ ہُوا۔

پھر مَیں نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو مسودہ بھیجا کہ وہ دُشمن کی نظر سے دیکھ کر انتخاب کردیں اور کہیں سُوجھ جائے تو اصلاح بھی کردیں۔ انھوں نے انتخاب کی ہامی بھرلی، اصلاح سے معذرت چاہی۔ سال سَوا سال کے بعد انھوں نے مجموعہ لَوٹایا۔ بڑی محنت کی۔ ایک ایک لفظ دیکھا۔ شاعر کی طبیعت کہاں رہتی ہے؟ انھوں نے کئی جگہ اصلاحیں بھی کیں، جنھیں انھوں نے تجویزوں کا نام دیا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۹۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"مَیں نے جو نشان لگادیے ہیں وہ محض تجویزی ہیں۔ آخری فیصلہ آپ کا ہی ہونا چاہیئے۔ مجھے احساس ہے کہ مَیں نے نظمیں کثیر تعداد

میں مسترد کی ہیں۔ مَیں چاہتا تھا کہ وہی نظمیں منتخب کروں جن کا لہجہ اور اسلوب نئے مزاج سے قریب تر ہو۔ دراصل پُورا کام ہی اس نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ اچھا بُرائی کو مقدم نہیں مؤخر کیا ہے۔ یعنی جو کلام مسترد کیا ہے وہ لازمی طور پر ساقط از معیار نہیں ہے۔

بعض جگہ مَیں نے الفاظ اور فقرے بدلنے کی تجویز کی ہے۔ تبدیلی کی توجیہہ آپ پر روشن ہی ہو گی۔ لیکن یہاں بھی آخری فیصلہ آپ کا ہی ہونا چاہیے۔"

مَیں نے اُن کی بیشتر اصلاحیں قبول کیں، بعض نہ کیں۔ ان کی مُسترد کی ہوئی بعض نظموں کو خارج کیا، بعض کو برقرار رکھا۔ جنھیں برقرار رکھا اُن کا ایک جزو نکال دیا۔ ملحوظ رہے کہ ۴۰۔۵۰ سال قبل کی نظموں میں آج کی حیثیت نہیں مل سکتی۔ میری جذباتی اور ذہنی حیات میں ان کی تاریخی اہمیت ہے۔ پھر بھی یہ ہے کہ مَیں نے جو قدیم نظمیں رُباعیات اور غزلیں برقرار رکھی ہیں، بعض اوقات ان میں سے کئی کے بارے میں ٹھٹک جاتا ہوں کہ کیا انھیں شامل کرنا مناسب ہے۔ اسی طرح جنھیں منسُوخ کیا ہے اُن میں سے کئی شعریت بیز پختہ نظموں کے بارے میں دُبدھا ہوتی ہے کہ کیا انھیں خارج کرنا ضروری تھا۔ یہ بھی واضح کر دوں کہ مَیں نے فارُوقی صاحب کی صاد کی ہوئی بہت سی رُباعیوں کو حذف کر دیا ہے۔

مجھے اپنی شاعری کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ بحیثیت شاعر نہ ماضی میں میرا کوئی مقام تھا، نہ حال میں ہے نہ مستقبل میں ہو گا۔ کہا تھا اس لیے شائع کر رہا ہوں لیکن جملہ تخلیقات کا شاید ایک چوتھائی حصّہ۔ مَیں کسی سے ستائش کا طلب گار نہیں۔ اگر کوئی ان اشعار کی خامیاں آشکارا کرے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اگر انھیں سِرے سے نظر انداز کیا جائے گا تو بھی مجھے کوئی مایوسی نہ ہو گی۔

"ارمغانِ فارُوقی" میں ڈاکٹر خواجہ احمد فارُوقی نے اپنی سوانح کو "عمرِ رائیگاں" کا عنوان دیا ہے۔ مجھے بھی اپنے بارے میں کچھ کچھ، پُوری طرح نہیں، ایسا ہی لگتا ہے۔ اصل

چیز تخلیق ہے، تحقیق و تنقید ثانوی ہیں۔ تحقیق کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق کی جانی چاہیے لیکن یہ ادب کا رشتہ زندگی سے کاٹ دیتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میرا مزاج شدت سے شاعرانہ ہے تو قارئین کو حیرت ہوگی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر ہوگی اگر میں کہوں کہ میں شدید ذوقِ جمال رکھتا ہوں اور زندگی کے ہر شعبے میں (اپنی ذات کے سوا) حسن و دیدہ زیبی ڈھونڈتا ہوں۔ یہ تلاش و ستائشِ حسن ایک روگ کی طرح لگی ہوئی ہے۔

"باغ و بہار" میں ایک کردار کا نام نعمان سیاح ہے۔ میں سیاح نہیں ہوں لیکن ہمیشہ سیاحت کا ارمان رکھتا ہوں۔ مجھے کوہ و سبزہ کے مناظر دیوانہ بنا دیتے ہیں، ان کے ساتھ آبِ رواں کی جل ترنگ بھی ہو تو سونے پر سہاگا، مجھے ہموار زمین کے مقابلے میں کاواک سطح، نشیب و فراز زیادہ پسند ہیں۔ کیا میں پچھلے جنم میں کسی کوہستان کا باشندہ تھا؟ میں ہمیشہ حیرت سے کشمیر کے کوکر ناگ کے چشمے، پہلگام کے پُرخروش لِدرنالے، ویری ناگ کے ایک تالاب میں سے جہلم کے برآمد ہوتے، گلمرگ کے برف بہ دوش سبزہ زار اور ٹانگمرگ کی جھیل کے کنارے پھولوں سے بھرے باغ کے بارے میں سوچتا ہوں۔ ایک دو بار دیکھا ہے، پھر دیکھنے کی ہوس رکھتا ہوں۔ میں بمبئی میں ساحلِ جوہو پر ایک فلیٹ میں ٹھہرا تو روزانہ کم از کم ایک بار سمندر میں جا کر دیر تک کھڑا ہوتا تھا۔ میں بحرِ ہند، بحرِ اوقیانوس اور بحر الکاہل تینوں کے پانیوں میں اپنے ہاتھ پاؤں تر کر چکا ہوں۔

مجھے سکم کی بودھ تہذیب اور افریقہ کے سیاہ فاموں کی زندگی دیکھنے کا ارمان ہے اور بشرطِ حیات دیکھوں گا۔ میرا ایک لڑکا نائجیریا (افریقہ) میں ملازم ہے۔ اس کے پاس جا کر افریقیوں سے بھی یاد اللہ کروں گا۔ کسی نے کیا خوب مصرع کہا تھا: نہ ہے روانیِ عمرے کہ در سفر گزرد۔ لیکن اس سے بھی بڑا سچ ذیل کے شعر کے مصرعِ ثانی میں ہے:

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگی بھی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

میں ضعیفی کی اس منزل میں داخل ہوگیا ہوں کہ سفر کی صعوبتوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ سیر و سیاحت کا ارمان ارمان ہی رہے گا۔ ایک امید لیے بیٹھا ہوں کہ شاید کبھی دُنیا کے دل کش نظارے کچھ اور دیکھ سکوں۔ یہ زندگی بڑی حسین ہے۔

مجھے تخلیق کار نہ ہونے پر افسوس ہے۔ اگر زندہ رہا تو اُردو محققین پر کتاب لکھنے کے بعد کسی طویل نظم کی تخلیق کی کوشش کروں گا۔

میں نے اپنی کسی کتاب پر کسی سے مقدمہ نہیں لکھایا۔ شعری مجموعے پر بھی نہ لکھاؤں گا کیونکہ اس کے معنی ہوں گے زبردستی اپنی تعریف کرانا جس کی میں ہمیشہ مخالفت کرتا رہا ہوں۔ اپنی شاعری اور شاعرانہ شخصیت کے بارے میں چند صراحتیں کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

در ایامِ جوانی چناں کہ اُفتد دانی کے مصداق میری شاعری کے دورِ اوّل کا اہم ترین موضوع عشق ہے۔ نظموں اور رُباعیوں کے عشقیہ مضامین پر میں قدرے محجوب ہوں۔ ایک طرف میرا معلّمی کا پیشہ، دوسرے میری موجودہ سفید ابروئی، نوجوانی میں جو باتیں زیب دیتی تھیں، اب انھیں پیش کرنا بے وقت کی راگنی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ راز افشا کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ماضی کی یہ حرف و حکایت چند جوانانِ مدرسہ سے متعلق ہے۔ اب اسے تقویمِ پارینہ سمجھ کر پڑھیے۔

میرے مزاج میں ایک خیال پرست رومانیت ہے۔ اِس دنیا سے دُور کسی رنگین جزیرے میں فرار کر جانا، تاروں سے اُوپر کے طبقے میں پرواز کر جانا، ایک خیالی دُنیا میں رہنا۔ یہ مستحسن نہ سہی لیکن ادبِ لطیف والوں کی یہ ہم نوائی مجھ سے نہیں چھوٹنے کی۔ ۱۹۸۸ء کی ایک غزل میں ذیل کا شعر میں نے خود کو خطاب کر کے لکھا تھا:

ہے بہت دلکش حدیثِ آسمان و ماہتاب
کیا کبھی دھرتی بھی ہوگی میرا موضوعِ سخن؟

میری کئی نظموں اور رُباعیوں کا موضوع یہی خیال پرستانہ فرار ہے۔

دوسرا رجحان فطرت پرستی کا ہے۔ جوش نے خود کو فرزندِ سحر کہا ہے۔ میں خود کو فرزندِ مہتاب کہہ سکتا ہوں۔ چاند اور چاندنی سے شدید تاثر میری کئی نظموں اور رُباعیوں کا موضوع ہے۔ اسی سے ملتا جلتا تاثر موسیقی کا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے کلاسیکی موسیقی، بالخصوص چند راگ، بہت مرغوب رہے ہیں۔ چاندنی میں ساز اور آواز کی آمیزش بھی میرے کئی اشعار میں ملتی ہے۔

تیسرا رُجحان تعقّل پرستی یعنی ادیان سے بغاوت کا ہے کا۔ یہ عہدِ طالبِ علمی کے ابتدائی دَور میں بھی ملتا ہے لیکن اسے پختگی ملی جوشؔ کی شاعری کے مطالعے سے۔ ان کی نظم "باغی روحوں کا کورَس" مجھے بہت پسند ہے۔ اقبالؔ کے بعد جوشؔ نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ شمسُ الرحمٰن فارُوقی صاحب نے تمام مذہب بیزار نظمیں اور اشعار خارج کر دیے تھے۔ میں نے بعض کو برقرار رکھا ہے۔ بہت سی ایسی نظمیں اور رُباعیاں خود میں نے خارج کر دیں جن کی اشاعت پر عبا اور ریش امبر کی طرف سے مجھے فرازِ دار پر آراستہ کر دیا جاتا۔

طالبِ علمی کے دَور کی شاعری میں مَیں نے جدید مغربی تہذیب اور ہندوستانی جوانوں پر اس کے اثرات کو مطعون کیا ہے۔ اب میرا نظریہ بدل گیا ہے۔ میں جدید سائنسی تہذیب کے خلاف نہیں لیکن اس کے بعض نتائج پر مذبذب ہوں۔ میری طالبِ علمی کی شاعری میں اس موضوع کو محض حدیثِ امنی سمجھنا چاہیے۔

مَیں خود کو جدید شاعری، بالخصوص جدید غزل سے ہم آہنگ پاتا ہوں، لیکن علامت نگاری اور ابہام کا قائل نہیں۔ جو کچھ دل میں ہے براہِ راست کہنا چاہتا ہوں تاکہ سُننے والے پر اثر ہو سکے۔

شمسُ الرحمٰن فارُوقی صاحب نے میری لچر شاعری کو دیکھنے پر بہت وقت ضائع کیا، بہت محنت کی۔ ان کا شکریہ کیوں کر ادا کروں۔ مَیں نے ان کے جملہ مشوروں کو نہیں مانا اور انھوں نے اس کی اجازت بھی دی تھی لیکن ان کی مجموعی رائے سے مجھے صحیح

رہبری ہوئی۔ اس مجموعۂ مزخرفات میں جو کچھ ہے اور جیسا ہے، اس کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہے، فاروقی صاحب پر نہیں۔

مجموعے کی خام کاری کی بنا پر اس کا نام "کچے بول" رکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ شاعری میرے موجودہ مقام اور عمر کے شایان نہیں لیکن اپنی تخلیقات دنیا کے سامنے پیش کرنے کا لپکا مجھے مہمیز کر رہا ہے۔ قارئین اگر اس سے منغض ہوں تو میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔ میں یو۔ پی اردو اکادمی کا ممنون ہوں کہ اس نے اس کی اشاعت کے لیے قابلِ قدر جزوی امداد بہم پہنچائی۔

لکھنؤ۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۹۱ء

ـــــ گیان چند

غزلیں

دورِ نو ۱۹۶۷ء تا حال

شعلہ دَر آغوش ہے دن، ملگجی ہے چاندرات
بیوۂ گُل فام کے مانند ہے رُوئے حیات

لگ رہا ہے آنکھ میں، یہ کیسا کڑوا سا دُھواں
اِک ذرا اُٹھ کر بڑھا ڈالو چراغِ کائنات

خواہشوں کے اَسپ دوڑایا کیے تیسر فقیر
طے نہ کر پائے مگر اُجھلیتوں کا پُلِ صراط

ہر قوی کے پاؤں کے نیچے لرز جاتی ہے یہ
کاش دھرتی کو بھی ہوتا آسماں کا سا ثبات

گندگی کے بیچ رہنے کو وہ کیوں مجبور ہیں
حُسن سے جن اہلِ فن کا ہے ازل سے ارتباط

خواہشِ گُل چینی، خوفِ خلق، فکرِ عاقبت
حضرتِ حق نے دیے انساں کو کیا کیا مُسکرات

اور شفق کی سُرخ زلفیں عطر برسانے لگیں
اُڑتے اُڑتے ہو گئی دو پنچھیوں میں ایک بات

پھول پی لو، پھول آنکھوں میں بسالو رات دن
زندگی کے دن ہیں کتنے مختصر! بس پانسات

مارچ ۱۹۶۷ء

برسات اب کے سال بہت زور کی ہوئی
لیکن نہ بجھ سکی مرے ہونٹوں کی تشنگی
دیکھا نہیں مقابلۂ حسن ایک بھی
واللہ آپ کی بھی ہے بے کار زندگی
بہروپ ہے فقط مرا دعوائے علم و فضل
میری فرشتگی میں چھپی ہے درندگی
جیسے بھری ہوں ٹین کے ڈبے میں مچھلیاں
یوں دل میں خواہشوں کی تہیں ہیں لگی ہوئی
آہنگ بہہ رہا تھا غبارِ نجوم سے
اب تک بسی ہے میرے تصوّر میں نغمگی
آیا ہوں جب سے شہر کی تنہائیوں کے بیچ
محفل مری ہے بعینہٖ طاؤس میں لگی
ہر آدمی کسی نہ کسی کا غلام ہے
ہندوستان ہے کہ کوئی کال کوٹھری
کھانے کو فائلیں ہیں تو پینے کو ہے دھواں
کیا زندگی ہے، ہائے، ہمارے حضور کی
اب کیسے شوق نامہ لکھوں روز آپ کو
ہر خط پہ مانگتے ہیں کمیشن مرارجی[1]
مئی ۶۸ء

[1] اس وقت کے وزیرِ خزانہ مرارجی دیسائی نے ۱۹۶۸ء کے بجٹ میں ڈاک کی شرحیں بڑھادی تھیں۔

کیا بتاؤں آپ سے، کیا ہستی انسان ہے
آدمی جذبات و احساسات کا طوفان ہے
محشرِ جذبات ہے فتحِ خلا کے باوجود
جو بشر شدّت سے جذباتی نہ ہو، حیوان ہے
اس قدر کھائے ہیں یاروں کے بچھڑ جانے کے داغ
دل نہیں اب، ایک خاکستر شدہ شمشان ہے
جیسے جیسے بڑھ رہا ہے میرا عُہدہ دوستو!
ویسے ویسے رُوح میری اور بھی ویران ہے
فکر میں لپٹا ہُوں گاہے، گاہ جذبے کا شہید
ذوقِ بینش کی بدولت زندگی ہلکان ہے
لڑکھڑاتا، ٹھوکریں کھاتا کدھر جاتا ہُوں مَیں
ہے اندھیرا گھُپ فضا میں اور دل سنسان ہے

حیف دانش گاہ جس میں اس قدر ہے قحطِ حُسن
جب سے آیا ہُوں یہاں، بزمِ نظر ویران ہے
پاکتا ہیں ہر طرف ہوں یا حسینوں کے پرے
برگزیدہ ہستیوں کا ایک ہی ارمان ہے
یہ سکھاتے ہیں وزیروں اور حسینوں ہی کو یوگ
واہ امریکہ پلٹ یوگی کی بھی کیا شان ہے
فکر کی دُنیا میں کو ملبس بنا پھرتا ہُوں مَیں
علم کی پہنائی کا کتنا بڑا فیضان ہے

آج امریکہ میں، کل لندن میں، پرسوں رُوس میں
عالموں کی سربلندی کی یہی پہچان ہے

مئی ۶۸ء

زندگی ٹوٹا ہوا دل جیسے
کوئی کھوئی ہوئی منزل جیسے
ہر طرف گھوم رہے ہیں سائے
گم شُدہ خوابوں کی محفل جیسے
مقصدِ زیست سے یُوں ڈرتا ہُوں
صید، قاتل کے مقابل جیسے
یُوں چلا خود شکنی کی جانب
مل گیا ہو مجھے ساحل جیسے
چاند پر چل کے بشر یوں خوش ہے
حل ہوئے سارے مسائل جیسے
موت کے در پہ یہ محسُوس ہوا
اب بھی ہیں چند مراحل جیسے
آئنہ عکس سے بے بہرہ ہے
ایک دیوار ہو حائل جیسے
ہوش میں محض رسیدہ پیکر
آنکھ لگتے ہی مقابل جیسے

۳۱ دسمبر ۷۲ء
لکھنؤ

بجھ گئی آگ، مگر اب بھی دُھواں باقی ہے
میری بستی میں بغاوت کا نشاں باقی ہے
توڑتی پھوڑتی چل، زیروزبر کرتی چل
سائنس کی تیغ! ابھی کارِ جہاں باقی ہے
رہنے دو نصب مِری آرزوؤں کے خیمے
تنِ کہنہ میں ابھی تلبِ جواں باقی ہے
بجلیاں کتنی ہی برسائیں مشیت نے مگر
جوئے ہستی میں رواں آبِ رواں باقی ہے
معجزے لاکھ دکھایا کیے زندہ بھگوان
ذاتِ انساں کا مگر سرِّ نہاں باقی ہے

دسمبر ۷۷ء

بہت سپاٹ گزرتی ہیں آج کل شامیں
نکل کے خول سے اپنے، افق کے پار چلیں
برہنہ پائی میں کیوں باغ و راغ میں گھومیں
سکون و صبر سے ہم پاؤں توڑ کر بیٹھیں
نہیں ہیں جسم یہاں، ہر طرف صلیبیں ہیں
کہ جن پہ لٹکی ہوئی ہیں کئی پھٹی روحیں
بھبک رہی ہے سروں میں وجود کی گرمی
پگھل رہی ہیں سیہ تارکول کی سڑکیں
نہ کچھ خودی میں دھرا ہے، نہ بے خودی میں کچھ
نہیں ہے فرق کوئی، ہوش میں رہیں، نہ رہیں

زمین ہے کہ کوئی کیکٹس کا بستر ہے
چلو ذرا کی ذرا، اوپری فضا میں اُڑیں
جنونیوں کی طرح تیز بھاگتی ہے بس
مگر یہ ضد ہے منازل کو، دُور تر بھاگیں
لگے ہے غولِ بیاباں سی ہر بڑی بلڈنگ
جو بیٹھیں سایۂ دیوار میں جھُلس جائیں
زمیں سے اُکھڑا ہُوا، ہر درخت، ہر انسان
نہیں یہ باغ ہمارا، چلو یہاں سے چلیں
یہ دشت بھی ہے انوکھا، شجر حجر بھی عجیب
کہیں اُگی ہیں زبانیں، کہیں فقط آنکھیں

مئی ۷۸ء

شاندار بنگلے سے، خس کا جھونپڑا بہتر
فوم اور ڈنلپ سے ٹاٹ و بوریا بہتر
نرم نرم گدّوں پر جسم چھٹپٹاتا ہے
سخت فرش کے اُوپر، تکیہ ہاتھ کا بہتر
آپ نے کہا جو کچھ، وہ تو سُن لیا مَیں نے
دل میں آپکے ہے کیا، جانے یہ خُدا بہتر
غور و خوض کیا ہوتا، کوئی بھی سمجھ پایا؟
سُن کے بات صاحب کی، سب نے کہہ دیا "بہتر"
ان کے سارے لفظوں کے مَیں سمجھ گیا معنی
پر کلام کا مفہُوم، جانے ہے خُدا بہتر

مئی ۷۸ء

جو بننا چاہتے ہو قوم کے بڑے خادم
تو اپنے ساتھ بہت سے نقیب لے کے چلو
جو بزمِ دوست میں جانا ملے کبھی یارو!
تو سر پہ نامۂ شوقِ رقیب کے لیے چلو

مئی ۷۸ء

دوغزلہ

جب لیٹیے، سرابِ تمنا دکھائی دے
ہر سُو ہوس کا آئینہ خانہ دکھائی دے
جس بولڈر کا خوابِ گراں دیکھتا ہوں میں
موّاج، اس میں وقت کا دریا دکھائی دے
جس پُر سکون چہرے کے نیچے ٹٹولیے
قلب و جگر میں آگ کا دریا دکھائی دے
جب کھول کر اُفق کے دریچے کو دیکھیے
یادوں کے ریگ زار کا صحرا دکھائی دے
ٹھہراؤ زندگی میں کہاں؟ چل چلاؤ ہے
اپنا مکاں بھی ریل کا ڈبّا دکھائی دے
ہے عرصۂ حیات کہ میدانِ کربلا
جس کو بھی دیکھیے، وہی پیاسا دکھائی دے
دُنیا ہے یا مفاد پرستی کی حشرگاہ؟
ہر شخص اپنے غم میں دِوانا دکھائی دے

جون ۷۹ء

جب بھی ترا جمالِ خود آرا دکھائی دے
پھولوں میں کھیلتا ہُوا دریا دکھائی دے

فردوس میں خرام کو مَیں جاؤں کس لیے؟
جب اُس نگر میں کوئی نہ تجھ سا دکھائی دے

مُونا لِزا ہے کیوں متبسّم ہر ایک شے پر
اَے حُسنِ منتظر! تو خُدارا دکھائی دے

نازاں بہت ہیں پردہ یمیں کی مہوشیں
اے کاش انھیں وہ برقِ نظارہ دکھائی دے

کہتے ہیں عورتوں کو نہ گھُورا کریں جناب
لیکن جو کوئی چاند سا مکھڑا دکھائی دے

میدانِ زندگی ہے کہ میدانِ کارزار؟
اِک دوسرے کے خون کا پیاسا دکھائی دے

بے چارہ کر رہا ہے تگ و تاز کس قدر؟
ہر انجمن میں غیر کا مُہرہ دکھائی دے

جون ۷۹ء

تکیے پہ شاہ جی کے کبھی آئیے جناب
مٹّی کی باس سونگھیے، سو جائیے جناب

کس واسطے زمین کے گز بن گئے ہیں آپ
اپنی کمر پہ کچھ تو ترس کھائیے جناب

یہ عہدۂ جلیل ہے، یہ کلبۂ سکوں
کیا آپ کو پسند ہے؟ فرمائیے جناب

کتنی کمیٹیوں کے رہیں گے حضور رُکن
کچھ اپنے ہاتھ میں پہ ترس کھائیے جناب

آئے تھے بانٹنے کے لیے دُکھ عوام کے
گھر بھر لیا ہے آپ نے، اب جائیے جناب

سُورج سے کہہ رہے ہیں یہ ذرّات خاک کے
یُوں روز روز ہم کو نہ بہلائیے جناب

احساسِ اہمیت سے دبے جا رہے ہیں آپ
بہتر ہے آسمان پر اِٹھلائیے جناب

دیوارِ قصر کہتی ہے اپنے مکین سے
مَیں بے بصر ہوں، مجھ سے نہ شرمائیے جناب

سب ٹھیک ہے نگر میں تردّد نہ کیجیے
اپنی حماقتوں میں بہے جائیے جناب

گر بڑھ گیا ہو آپ کے اعصاب کا تناؤ
صحرائے تعمیِ ذات کے سو جائیے جناب

جون ۷۹ء

اِس نگر میں کتنے ظالم ہیں مکاں کے فاصلے
دوستوں کو بانٹ دیتے ہیں یہاں کے فاصلے

مذہبوں نے مست ہو کر گائے اپنے زمزمے
بڑھ گئے کچھ اور ابنائے زماں کے فاصلے

کس قدر اُونچی ہیں صاحب کے مکاں کی سیڑھیاں
کون کر پائے گا طے اُس نردباں کے فاصلے

عرش والے خاکیوں کی بات سمجھیں کس طرح
بولیوں میں ہیں زمین و آسماں کے فاصلے

ذات کی گہرائیوں میں جس نے جھانکا، کھو گیا
پاشکن ہیں اس جہانِ بے نشاں کے فاصلے

جس قدر بڑھتا ہوں میں اتنے ہی بڑھ جاتے ہیں وہ
میری جدّ و جہد اور اس آستاں کے فاصلے

کیوں مرے انشائیے پر اتنے آزردہ ہیں دوست
تیغِ قاطع ہیں یہ ابلاغ و بیاں کے فاصلے

دُھوپ اپنے ساتھ کے سائے سے یُوں کہنے لگی
مستقل ہیں کیا ہمارے درمیاں کے فاصلے

بے مروّت، بے وفا یہ پتھروں کا شہر ہے
اجنبیت کو بڑھاتے ہیں یہاں کے فاصلے

جنوری فروری۔۸۰ء

کس قدر بے کیف دُنیائے دنی ہے صاجو؟
بے بسی ہے، بے حسی ہے، بے رُخی ہے صاجو

ہر کلی کے ہونٹ پر پپڑی جمی ہے صاجو
پیاس کے جنگل میں کتنی بے کلی ہے صاجو

چاند محسن کُش تھا، سُورج کو دبا کر کھا گیا
گو اسی کے دَم سے اس میں روشنی ہے صاجو

دیکھنا، للچانا اور محرُوم رہنا آئے دن
انفعالی زندگی، کیا زندگی ہے صاجو

دوسروں کو روند یے اور آگے بڑھتے جائیے
بعض اہلِ شہر کا مسلک یہی ہے صاجو

بانس پر مجھ کو چڑھائیں لاکھ، اربابِ غرض
جانتا ہوں میں، جو اصلیت مری ہے صاجو

چل کے ریگستان میں دیکھیں سَرابُ اندر سَراب
خود فریبی میں قیامت دل کشی ہے صاجو

شام کو چڑیوں کی چوں چوں، رات کو مینڈک کا شور
یہ حقیقت کا ئناتی شاعری ہے صاجو

کیوں مُصر ہیں آپ، ہم سیدھی ڈگر ہی پر چلیں
یہ تشخص سے ہمارے، دشمنی ہے صاجو

سیرِ فردوسِ نظر کو منع فرماتے ہیں وہ
شیخ صاحب کے تخیل کی کجی ہے صاجو

جھانک کر دیکھا جو میں نے اندرونِ لاشعور
اس زمیں پر کس غضب کی زندگی ہے صاجو!

کس لیے مبہوت ہو خوش خوابیِ ماضی میں تم؟
حال کی دل داریوں میں کیا کمی ہے صاجو؟

اپنے اپنے دیکھنے کے ڈھنگ پر ہے منحصر
زندگی میں تازگی ہی تازگی ہے صاجو

اِس میں سوزِ دل مِلا دو تو شفق بن جائے گی
یہ جو مطلع پر ذرا سی روشنی ہے صاجو

فروری ۸۰ء

یہ جو آئینے میں اِک عکس عیاں ہے یارو
کسی مرحوم تمنّا کا نشاں ہے یارو

ہر دُکاں میں نظر آتے ہیں ذکی الحس دل
زندگی کارگہِ شیشہ گراں ہے یارو

دَوڑ میں اپنے حریفوں کو بڑھاتا آگے
میری قسمت میں یہی رطلِ گراں ہے یارو

کتنے افکار کی تخلیق کیا کرتا ہے !
یہ جو اِک چہرۂ بے نام و نشاں ہے یارو

یا اخی ! کہہ کے بُلاتا ہے کوئی کوہِ ندا
چار عنصر میں کہیں شورِ فغاں ہے یارو

عمر بڑھتے ہی بدن دَرد سے مفلوج ہوا
چشم بھر جائے مگر زور جواں ہے یارو

کاش دروازے کی گھنٹی کو بجاتا کوئی
کس قدر دُور فتادہ یہ مکاں ہے یارو

کل کے اخبار کے مانند ہیں باسی ہم لوگ
اجنبی ہم سے، ہر اک چشمِ جواں ہے یارو

ہم کبھی متّفق الرّائے نہیں ہو سکتے
مَیں ہُوں کہنہ، مرا فرزند جواں ہے یارو

جب بھی سیڑھی یہ چڑھوں سانپ مجھے ڈس جائے
یہ عجب سلسلۂ سُود و زیاں ہے یارو

فروری ۸۰ء

دو غزلہ

زورِ آشفتہ سری ہے شہر میں
نزع جیسی زندگی ہے شہر میں

اہلِ زر کی زرگری ہے شہر میں
مفلسی ہی مفلسی ہے شہر میں

گاؤں میں لٹھ باز ہیں، جنگل میں ریچھ
اژدہوں کی قاہری ہے شہر میں

میرے سب کاغذ، کتابیں پھونک دو
کس غضب کی تیرگی ہے شہر میں

ہر گلی، ہر بام پر بکتا ہے گوشت
ناج کی کتنی کمی ہے شہر میں

گاؤں سے دریا چلا ہے شہر کو
سیمیائی دل کشی ہے شہر میں

ہر گلی کوچے میں کالج کھل گئے
جاہلی رچ بس گئی ہے شہر میں

ہم تو شیرینی کو ترسا ہی کیے
ایک مصری کی ڈلی ہے شہر میں

دل رُبائی، دلبری ہے شہر میں
سیم و زر کی ساحری ہے شہر میں

گاؤں میں ہر سمت ہے بد ہیئتی
حسن کی جلوہ گری ہے شہر میں

ہر طرف جلتے ہیں جسموں کے الاؤ
روشنی ہی روشنی ہے شہر میں

کیا دلوں کو لگ گیا سورج گرہن
دوپہر میں تیرگی ہے شہر میں

روشنی سے دوست کی، جلتے ہیں دوست
یہ غلط ہے، بے حسی ہے شہر میں

پارساؤں کی مصیبت آ گئی
ایک حورِ پارسی ہے شہر میں

بے گھرے اک شب کو اپنا گھر بسائیں
ایک جادو کی گلی ہے شہر میں

ساتھ والے سے تعارف تک نہیں
واہ کیا ہم سائگی ہے شہر میں

چور، نیتا، راہزن، بردہ فروش
زندگی صد رنگ کی ہے شہر میں

جون ۸۰ء

معاصرین کے دل کا غبار رہیں ہم لوگ
گلِ سرِ سبدِ روزگار رہیں ہم لوگ

زماں کے غار کے نقش و نگار ہیں ہم لوگ
زوال میں بھی بہت شاندار ہیں ہم لوگ

تمام عمر لڑا ہی کیے زمانے سے
اور اس کے بعد بھی باغ و بہار ہیں ہم لوگ

زمانہ یاد رکھے گا ہماری ایک اک بات
اگرچہ آج بہت کم عیار ہیں ہم لوگ

عروجِ بارگہِ فکر کے کھنڈر ہیں ہم
ہماری سیر کرو، یادگار ہیں ہم لوگ

ہماری بات سنو، ہم کو حرف حرف پڑھو
کمالِ فن کی گزرتی بہار ہیں ہم لوگ

نہ جانے کب، وہ ہمیں زینتِ شکم کرلے
پلنگِ وقت کے اوپر سوار ہیں ہم لوگ

کسی کو دے نہیں سکتے ہرا بھرا سایہ
کبھی چمن تھے، پر اب خارزار ہیں ہم لوگ

ہماری کم سخنی کو نگاہِ کم سے نہ دیکھ
کہ آفتابِ سرِ کوہسار ہیں ہم لوگ

جون ۱۹۸۰ء

جو کوئی روئے شکستہ دکھائی دیتا ہے
مجھے وہ اپنا ہی چہرہ دکھائی دیتا ہے

محیطِ زیست میں ہیں ایک دوسرے سے دُور
ہر ایک شخص جزیرہ دکھائی دیتا ہے

یہ کیسا آئنہ ہے؟ جب بھی دیکھتا ہوں اسے
کوئی خبیث سا بوڑھا دکھائی دیتا ہے

کسی کو بھوک ہے عہدوں کی اور کرسی کی
کوئی نمود کا رسیا دکھائی دیتا ہے

کہاں کا علم، کہاں کا ادب، کہاں کا فن؟
ہر ایک، زر کا دِوانا دکھائی دیتا ہے
قلم بکاؤ ہیں، جتنے بھی چاہو، لے ڈالو
وزیر بھاؤ بڑھانا دکھائی دیتا ہے
اصُولِ فن کے سوالات اس زمانے میں؟
یہ شخص مجھ کو دِوانا دکھا دیتا ہے
ہزیمتوں کے کچوکے جو رات دن کھائے
اُجاڑ شہرِ تمنّا دکھائی دیتا ہے
نہیں ہے عُمر گذرنے کا اس پہ کوئی اثر
وہ چہرہ پھُول سا تازہ دکھائی دیتا ہے
دُکانِ شوق بڑھانے کا وقت آ پہنچا
مگر میں روز ہی چنگا دکھائی دیتا ہے

دسمبر ۱۹۸۱ء

اُڑ رہے ہیں فضاؤں میں جو طیُور
ہیں مُسلسل اُڑان کے مقہُور
شہر پر چھائی ہے شبِ دیجوُر
دشت و دَر میں چھلک رہا ہے نوُر
علم میں بھی نشہ ہے اور بھرپوُر
کوئی مسرُور ہے، کوئی مغرُور
رگِ گردن تنی ہی رہتی ہے
آپ جب سے ہوئے بہت مشہوُر

رات دن ساتھ رہتے ہیں دونوں
کس قدر پاس اور کتنی دُور
زندگی فاصلوں کی ماری ہے
اِک نگر میں بھی ملنے سے مجبُور
شیب کے بولڈر سے ٹکرا کر
ہوگئیں خواہشات چکنا چوُر
بے دماغی نے دھیان بھی نہ دیا
مَیں پکارا کیا "حضور، حضور"
تیَرنا ڈُوبنا نہیں ممکن
یہ سمندر ہے ریت سے معمُور
چَل رہا ہُوں اگرچہ صدیوں سے
اَب بھی میرے لیے ہے دلّی دُور
بھُول بیٹھا قمر زماں اس کو
جب سے بُوڑھی ہوئی ہے بدرِ بدور

فروری مارچ ۸۴ء

ذرّہ ذرّہ اِس جہاں کا زندگی بردوش ہے
آدمی ہو یا شجر ہر کوئی رفعت کوش ہے
محفلِ تہذیب میں غوغائے نوشانوش ہے
کون سُنتا ہے اسے؟ سقراط تو خاموش ہے

لہ الف لیلیٰ کی ایک داستان کے ہیرو ہیروئن۔

چاند نے سنتور سے برسائی ایمن کی پھوار
دم بخود لیتی ہے شبنم، چاندنی بے ہوش ہے
کوئی شعلہ سا سامنے آ جائے تو یہ کھل اُٹھے
برگِ مُردہ کی رگوں میں آتشِ خاموش ہے
شہر میں ہے گندگی، دشت و جبل کاواک ہیں
پھر بھی شاعر کا تخیل حسن در آغوش ہے
منتظر ہے پردۂ ظلمات میں آبِ حیات
دورِ حاضر کا سکندر مضمحل، بے جوش ہے
کیا فلک پر حرفِ اقدس آدمی کا جائے گا
آج کی شب آسماں گویا سراپا گوش ہے
بندرا بن بے گیاہ و برگ، رادھا ہے اُداس
ہے کرشن انگشت برلب، بانسری خاموش ہے

مارچ ۸۳ء

کس کس دیار و شہر سے نکلے ہوئے ہیں ہم
بے جڑ کے ہیں، زمین سے اُکھڑے ہوئے ہیں ہم
ہر لمحہ وقفِ غیر یقینی ہے دوستو!
لاعلمیوں کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم
جسم اور ذات دونوں مسلسل کٹا کیے
ہر روز پچھلے روز سے چھوٹے ہوئے ہیں ہم
مانا کہ شہر شہر چمکتی ہیں بجلیاں
قلب و نظر کے نور کو ترسے ہوئے ہیں ہم

شہرِ ہوس میں ہم کو ملیں وہ سزیمتیں
ہر شخص کی نگاہ میں ہلکے ہوئے ہیں ہم
اہلِ شباب چھوڑو ہمیں، آگے بڑھ چلو
کیونکر نبھائیں ساتھ کہ بوڑھے ہوئے ہیں ہم
یاروں کی بھاگ دوڑ، اُچھل کود دیکھ کر
یہ کھُل گیا کہ وقت سے بچھڑے ہوئے ہیں ہم

جون ۸۳ء

آپ سوتے جاگتے دیکھا کریں محلوں کے خواب
میرے سر پر سایۂ دیوار رہنے دیجیے

جون ۸۳ء

جہاں میں کون کسی کو سہارا دے پائے
ہر آدمی کو اُٹھانی ہے اپنی اپنی صلیب

جنوری ۸۴ء

فاتح رہا ہے خون، حسینؓ شہید کا
دُنیا سے تخم اُٹھ گیا شمر و یزید کا

۸۴ء

ڈاک آتی ہے روز ہی لیکن
کوئی اچھی خبر نہیں آتی

۸۴ء

(پاؤں میں فریکچر ہونے پر)

عدم کی سمت چلا جا رہا ہوں تیزی سے
گلہ ہو کیوں مجھے اپنی شکستہ پائی کا

فروری ۸۶ء

آپ کے واسطے گُل پیرہنی ہے صاحب
زندگی میرے لیے ناگ پھنی ہے صاحب
کھو گئی اپنی زمیں، اپنی زباں، اپنے لوگ
پھر بھی دل کش یہ غریب الوطنی ہے صاحب
مَیں نے اِک گھونٹ مئے آگہی پی تھی کبھی
آج تک جسم میں اعضا شکنی ہے صاحب
کوئی یک چشم قلندر ہی کہیں سے آجائے
آج کی رات، سمندر کی گھنی ہے صاحب
ایک ہی حرفِ پریشاں پہ ہزاروں انعام
وہ قلم کا نہیں، قسمت کا دھنی ہے صاحب
شامِ بے کیف ہے، ٹی وی کے خیاباں میں چلیں
اس مرقّع میں فقط گُل بدنی ہے صاحب
یہ سفر، تیز سفر، حرف کے اِسپٹنک میں
بحر میں غوطہ زنی، کوہکنی ہے صاحب
رہگزر میں بھی حسیں، ٹیلی وژن میں بھی حسیں
جان پر اہلِ طریقت کے بنی ہے صاحب

نومبر ۸۶ء

ڈگمگاتا، لڑکھڑاتا، جھومتا جاتا ہوں مَیں
تجھ تک اے بابِ فنا سینے کے بَل آتا ہوں مَیں

جب بھی ریگستان میں جانے کا ہوا ہے اتفاق
زانو زانو ذات کی پرتوں میں دھنس جاتا ہوں مَیں

لے چلو کف پر سرِ شوریدہ کا روشن چراغ
ہے اندھیرا سا اندھیرا بن میں گھبراتا ہوں مَیں

ہے جزیرۂ آگہی کا لاکھ طوفانوں کے بیچ
کشتیِ اوہام میں اُس تک بہا جاتا ہوں مَیں

پھر رہی ہے بے یقینی کارواں در کارواں
وادیِ تشکیک میں کتنا سکوں پاتا ہوں مَیں

چل کے باغِ سیب میں اوراقِ جمشید کی پڑھوں
اپنی کیفیت سے خود کو بے خبر پاتا ہوں مَیں

گوشے گوشے میں فروزاں آتشِ لب ہائے سُرخ
اِس شفق میں دم بدم آنکھوں کو نہلاتا ہوں مَیں

آہ وہ آنکھیں کہ جن کے گرد ہے اودا غبار
گہہ کنوئیں میں ڈوبتا ہوں گہہ اُبھر آتا ہوں مَیں

مئی ۸۸ء ۔ امریکہ

پھر صحیفوں کی خریدار ہوئی جاتی ہے
رُوح لفظوں میں گرفتار ہوئی جاتی ہے
ہُوں وہ محروم بشیت بھی خجل ہے مجھ سے
شرم سے مثلِ خطاکار ہوئی جاتی ہے

شعلۂ حرفِ بغاوت سے اسے پگھلا دیں
مُہر بھی بر لبِ افکار ہوئی جاتی ہے
عسکری کھیل سکھا دو خسِ کاہیدہ کو
پھر فضا دشمنِ اسرار ہوئی جاتی ہے
مَیں نے اِک عمر میں جو عزّت و وقعت پائی
آج غارت سرِ بازار ہوئی جاتی ہے
بے دلی، بددلی، واماندگی، نقدانِ ہوس
زیست بے مقصد و بیزار ہوئی جاتی ہے
مجھ کو سپنوں کے غبارے میں اُڑے جانے دو
کیوں خِرد، خواب سے بیدار ہوئی جاتی ہے
جس طرف دیکھیے بھرتے ہیں چہکتے ہوئے پھول
پھر طبیعت گُلِ گلزار ہوئی جاتی ہے

جون ۸۸ء امریکہ

تہذیب نے زمیں پہ عجب گُل کھلائے ہیں
زنداں بنائے ہیں، کہیں چکلے سجائے ہیں
ہر چہرہ اجنبی ہے، نظر چیستاں ہے
اتنے بڑے نگر میں، ہمیں اِک پرائے ہیں
پہلے تو ساز و برگِ ہوس خلق کر دیا
پھر معصیت کے نام پہ دُرّے لگائے ہیں
آزادیِ خیال و قلم کا علَم اٹھائے
ہم معرکوں کے قلزمِ خوں میں نہائے ہیں

جس ٹھور بیچتے تھے سیانے دوائے دل
ہم نے وہاں ببولِ ہزیمت اُگائے ہیں

آجا سنہری زُلف لیے خانہ باغ میں
کتنے گُل آفتاب روش پر بچھائے ہیں

کرتے ہیں اہلِ حُسن ادب سے ہمیں سلام
کم بخت شَیب نے یہ بُرے دن دکھائے ہیں

دل کی سیاہی، سر کی سفیدی سے ڈھانپ کر
کیا کیا سوانگ اہلِ ریا نے رچائے ہیں

اے کاش وہ سموم حقیقت سے بچ سکیں
ہم نے جو خواب دن کے چمن میں کھلائے ہیں

جون ۸۸ء، امریکہ

حکایتِ لب و رُخسار میں گزار یہ وقت
جہاں میں صرف گھڑی دو گھڑی بسیرا ہے

جلاؤ گھر کی مُنڈیروں پہ چشم و دل کے چراغ
سُناؤ گیت برہ کے، بہت اندھیرا ہے

وہ محتسب ہو کہ شحنہ کہ مفتی و قاضی
ہمارا کوئی نہیں ہے، ہر ایک تیرا ہے

مِرے دماغ کے خنّاس نے پسند کیا
کھنڈر کہ ہفت بلاؤں کا جس میں ڈیرا ہے

مَیں برگِ زرد ہوں، شایانِ التفات نہیں
ہے تازہ پھول، جسے تتلیوں نے گھیرا ہے

جون ۸۸ء، امریکہ

ابر پارہ ہوں کوئی دم میں چلا جاؤں گا
نقش بر آب ہوں، لہروں میں سما جاؤں گا
یہ عقائد ہیں چھلاوے، انھیں افشا کر کے
معنیِ سیمیا دُنیا کو بتا جاؤں گا
سر ہیں، سُودوں کے بُنا کرتا ہوں تانے بانے
اہلِ تدبیر کو چکّر میں پھنسا جاؤں گا
کیسے ترسیل کروں سامعۂ یاراں تک
شہرِ آشوب، پرندوں کو سُنا جاؤں گا
مجھ کو بے رُوح کتابوں سے بصیرت نہ ملی
شہر سے جاتے ہوئے سب کو جلا جاؤں گا
خود سے مل جائے گا جو کچھ وہ دل و جاں سے قبول
کسی خلعت کے لیے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا
دل کشی لذتِ عصیاں کی نہ پوچھو یارو
اس کے اسرار حسینوں کو بتا جاؤں گا
آپ کہتے ہیں کہ تخلیقِ سخن خدمت ہے
شاعری کرتا رہوں گا تو میں کیا کھاؤں گا

جون ۸۸ امریکہ

ذرّہ ذرّۂ جہاں، میکدہ بہ دوش ہے
سرخوشی بہ چشم ہے، ولولہ فروش ہے
ہمہموں کے پنکھ سے اُڑتے ہیں شجر حجر
وادیِ نگاہ میں رنگ و بو کا جوش ہے

مائلِ شباب ہے، کہنگی و خستگی
آج ہر ضعیف کو شوقِ نائے و نوش ہے

آسماں سے بہہ چلا ایک چشمۂ نشاط
کل جو غرقِ یاس تھا آج عیش کوش ہے

سنگ کی رگوں سے بھی پھوٹتی ہے زندگی
فلسفہ کا موت کے آج کس کو ہوش ہے

بر بطِ شباب پر گا وداع کی غزل
موت کا سیاہ دف اِک ذرا خموش ہے

کلیرنیٹ میں بجاؤ پوریا دھنا سری
عارفوں کی انجمن آج بے خروش ہے

جون ۸۸ امریکہ

زندگی تو نے یہاں لا کے رُلایا ہے بہت
کاٹ ڈالی کہ ہمیں پیار کا سایا ہے بہت

اے غمِ عشق و غمِ دہر کہیں کیا تم سے
تم نے مِل کر دلِ خستہ کو دُکھایا ہے بہت

جوق در جوق ہیں کیوں احمریں ہونٹوں والے
ایک ہی دل کی خرابی کو خدایا ہے بہت

شاعرو! آج خدارا کوئی تازہ موضوع
دل و دلبر کا فسانہ تو سُنایا ہے بہت

دل ہے وحشی، اسے شہروں میں سکوں کیسے ملے
سیلِ دانش نے یہاں شور مچایا ہے بہت

اژدر و گرگ کے جنگل میں چلا جاؤں گا
مجھ کو باریک مشینوں نے ڈرایا ہے بہت

جون ۸۸ء امریکہ

یہ شبابِ تازہ اس کا، یہ مرا کہنہ بدن
آگ اور برفاب کا، اے وائے ہو کیونکر ملن
عارض و لب احمریں، زلفیں طلائی، سیم تن
باغِ قدرت سے کہیں بڑھ کر ہے انسانی چمن
دیکھنے میں جو بہت معصوم شرمیلے لگیں
دل لبھانے کے لیے کرتے ہیں وہ کیا کیا جتن
چاٹ لیں کتنی کتابیں، کتنے مخطوطے پڑھے
پر نہ آیا مہ وشوں کو رام کر لینے کا فن
ہے بہت دلکش حدیثِ آسمان و ماہتاب
کیا کبھی دھرتی بھی ہو گی میرا موضوعِ سخن؟
پہلے مجھ کو آگہی دی اور پھر ناآشفتگی
اے مشیت! تو خدارا اس قدر ظالم نہ بن
میں اُکھڑتا اور جمتا ہی رہا ہوں عمر بھر
ہر جگہ مَیں غیر ہوں، کوئی نہیں میرا وطن
مَیں کہ ایک وحشی ازل کا، رہنے والا غار کا
بھیڑ والے شہر میں لگتا نہیں ہے میرا من
مجھ کو آثارِ قدیمہ کی گرہ میں باندھ دو
میرے موضوعات میں ہے کس قدر فرسودہ پن

کیوں لباسِ چاک کو بدلوں نئی پوشاک سے؟
میں بھی کُہنہ ہوں مجھے بھاتا ہے اس کا کُہنہ پن
جھونپڑی میں عز و اہمیت کی رکھا ہے مجھے
تُو نے کتنا چین بخشا، اے خدائے ذوالمنن
آپ کہتے ہیں کہ امریکہ ہے فردوسِ زمیں
مجھ کو ہے پیارا مگر، دوزخ نشاں اپنا وطن

جُون ۸۸ء امریکہ

روز لڑنا پڑا ہے کِسی کے لیے
ہم نے احسان کیوں زندگی کے لیے
چشمۂ زندگی سے ہمیں کیا مِلا ؟
چند بوسے جگر تشنگی[1] کے لیے
مَوت ہے جس کا انجام اور منتہا
لوگ مَرتے ہیں اس زندگی کے لیے!
جل گیا میری ہستی کے ایمن کا پیڑ
ایک دو پَل کی تابندگی کے لیے
یہ بدن، جنسیت اور ہَوس کا غلام
خُلد میں جائیں اِس دوزخی کے لیے؟
قوم مذہب علاقہ، زبان ذات پات
کتنے پھندے ہیں ایک آدمی کے لیے

---

[1] جگر تشنہ = بہت مشتاق۔ جگر تشنگی بمعنی بسیار آرزومندی۔

یہ روپیّہ بہت ہی بُری چیز ہے
پھونک دے دوسروں کی خوشی کے لیے
مَیں نگر یا ڈگر یا عدم میں رہوں
فرق پڑتا ہے کیا اجنبی کے لیے

جُون ۸۸، امریکہ

دل یہاں کتنا ہراساں ہے، مجھے جانے دو
یہ نگر موت کا زنداں ہے، مجھے جانے دو
ہر طرف کرگدن و گرگ و شترمُرغ کے غول
شہر مانندِ بیاباں ہے، مجھے جانے دو
انجمن گاہ یہ کیسی ہے کہ دَم گھُٹتا ہے
صورتِ چاہِ سُلیماں ہے، مجھے جانے دو
اس خرابے کی فضا میں ہے یتیمی کا غبار
ہر مکاں گورِ غریباں ہے، مجھے جانے دو
دَم بدم مجھ کو بلاتا ہے مِرا کوہِ ندا!
زندگی مجھ سے گریزاں ہے، مجھے جانے دو

دسمبر ۸۸ء

لہ تلفظ رُپے یا۔

فکاہیہ غزلیں

گو بہت ہے جمتوں میں حسنِ رہگذر یارو
ہم کو کیا؟ کہ ہم تو ہیں صرف ماسٹر یارو

لڑکیوں کے کالج کے پاس ہے پولس تھانہ
اِس طرف گزر کرنا دیکھ بھال کر یارو

جو زکام کھانسی کا نسخہ لکھ نہیں سکتے
یونیورسٹی میں ہیں ایسے ڈاکٹر یارو

ان کے رُوم میں جاتے لڑکیاں جھجکتی ہیں
اِس قدر ہیں زندہ دل ایک لکچرر یارو

فلسفہ پڑھاتے تھے اور عشق کرتے تھے
ڈاکٹر عزیز احمد خوُب تھے، مگر یارو

اِک وزیر کا داماد، اِک مُدیر کا سالا
بولیے! بنائیں ہم کِس کو لکچرر یارو

قیس کا جو دیکھا کام، بولے فلم ڈائرکٹر
عاشقی نہ آئے گی اِس کو عمُر بھر یارو

گہہ کتاب خانے میں، گہہ شراب خانے میں
کٹ گئی کسی صُورت، قصّہ مختصر یارو
اُف مِری غلط فہمی! تھا وہ بیمے کا ایجنٹ
جس کو مَیں نے سمجھا تھا وائس چانسلر یارو

مارچ ۶۷ء

آپ حضرات جسے علم کا گھر کہتے ہیں
ہم گنہ گار اسے چاند نگر کہتے ہیں
گھُور کر دیکھتے ہیں میرے قبیلے کی طرف
رات دن جو متعلّم مجھے "سَر" کہتے ہیں
طالبِ فلم کو اَب کہنے لگے طالبِ علم
بے زباں شخص کو سَب لیکچرر کہتے ہیں
نقل کر کے طلبہ فرسٹ ڈویژن لائے
ہم اسے اپنی ریاضت کا ثمر کہتے ہیں
میری آنکھوں میں سَدا دُھول ہی جھونکی اُس نے
اہلِ ارشاد جسے نورِ نظر کہتے ہیں
کیا قیامت ہے کہ محتاط محقق ماں سے
"دیجیے کچھ سَندِ نامِ پدر" کہتے ہیں
دے دیا گر خمِ سر سے مِری کورنش کا جواب
اس کو صاحب کی عنایت کی نظر کہتے ہیں

ے اِس شعر کی لفظ کا صحیح تلفظ کُرنِش ہے۔ اِس میں واو غیر ملفوظی ہے اور اعراب بالطرف کے طور پر ہے۔

مَیں نے ایک عین دبایا تھا کسی مصرع میں
چھڑ گیا قصۂ چکبستؔ و شررؔ کہتے ہیں
شعر موزوں نہیں پڑھ سکتے محمد فاضل
روز غالب شکنِ اشعار، مگر کہتے ہیں
شرح بھی ساتھ میں چھپوایا کریں، بندہ نواز!
آپ اقلیدسی اشعار، اگر، کہتے ہیں

اکتوبر ۱۹۶۸ء

جس کو سمجھے تھے اقلیدسی مسئلہ
پڑھ کے دیکھا تو افسانہ تھا وہ نیا
خواہ بیٹھا ہو کرسی پہ کوئی گدھا
میری نظروں میں ہے وہ مہادیوتا
چڑھتے سورج کی سب نے پرستش جو کی
خود کو سچ مچ سمجھنے لگے وہ خدا
جس نے پھونکا تھا کالج کے پنڈال کو
آج ڈپٹی منسٹر ہے وہ چھوکرا
سارے شاعر کی دُم الیٹ بن گئے
جب سے چرچا نئی شاعری کا ہوا
مَیں نے چھپوا دی شب خون میں جو غزل
ساری لاشیں اُڑنے لگیں مضحکہ
ڈر ہے، بانکے نہ پڑ جائیں پیچھے مِرے
کر تو دوں مَیں نئی نظم پر تبصرہ

کاش انھیں پھونک دے نکسلائٹ کوئی
فائلوں کا ہمالہ بہت بڑھ گیا
کون میرا پڑوسی ہے کیسے کہوں ؟
مَیں نہیں جانتا اپنے گھر کا پتا
پھول کِھلتے گئے، لہلہاتے گئے
جس جگہ پاؤں اِس شاخِ گُل کا پڑا

نومبر ۶۸ء

پیروڈی غزل

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں غالب صدی کے موقع پر منعقدہ مشاعرے کا مصرعِ طرح تھا: " دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دُنیا و چہ دیں "۔ یہ غالب کے ایک قصیدے سے لیا ہُوا مصرعِ طرح ہے۔ مَیں نے یہ جدت کی کہ اس قصیدے کے چند اشعار کے مصرعِ ثانی لیے اور ان پر گرہ لگا کر غزل تیار کی۔ کہاں وہ مشکل منقبتی قصیدہ، کہاں اس کے مصرعوں سے مزاح پیدا کرنا۔ مَیں ہر شعر کے نیچے قوسین میں غالب کا پہلا مصرع درج کر رہا ہوں۔

کھا کے ایل ایس ڈی کہتی تھی کوئی زہرہ جبیں
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دُنیا و چہ دیں
(لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم)

کہتے ہیں غازہ و سُرخی کے بنانے والے
ہم کہاں ہوتے، اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں
(دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں)

ہار کر لوک سبھا کے لیے، روتے ہیں مہنت
بیکسی ہائے تمنّا کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں

(بے دِلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق)

لے لے مخطُوطہ مِرا، لاٹری پانے والے!
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

(جنسِ بازارِ معاصی اَسداللہ اسد)

آپ کی سینڈلوں سے جو زمیں پر لگ جائے
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

(جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا، جس کا)

ہر طرف اُلٹی مثلّث نظر آتی ہے مجھے
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

(بُرشِ تیغ کا اس کی، ہے جہاں میں چرچا)

ایک بوسیدہ مکاں بھی نہ کیا ہم کو الاٹ
وقفِ احباب گُل و سُنبلِ فردوسِ بریں

(صَرفِ اعدا، اثرِ شعلہ و دودِ دوزخ)

جنوری میں جو مَیں کشمیر گیا تو دیکھا
جوشِ دوزخ ہے خزانِ چمنِ خُلد بریں

(خانہ ویرانیِ امّید و پریشانیِ بیم)

جب سے کلّو کو وزارت ملی، اس دن سے ہوا
قبلۂ اہلِ نظر، کعبۂ اربابِ یقیں

(معنیِ لفظِ کرم، بسملۂ نسخۂ حسن)

لاٹری ملتی نہیں، پھر بھی ٹکٹ لیتا ہُوں
نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

(سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہُوں لیکن)

افسران و وزرا کون سی شے ہیں اے سیٹھ
عرش چاہے ہے کہ ہو در پہ ترے خاک نشیں

(ذوقِ گُل چینیِ نقشِ کفِ پا سے تیرے)

بیڑی پیتے رہے ڈائس پہ منسٹر صاحب
یک قلم خارجِ آداب و وقار و تمکیں

(کس قدر زہرہ گدا ہُوں کہ عیاذاً باللہ!)

آئی اے ایس کی کاپی میں یہ لکھ کر دے آئے
فکر کو حوصلۂ فرصتِ ادراک نہیں

(اس کی شوخی سے بہ حیرت کدۂ نقشِ خیال)

لگ سکے مصرعِ غالبؔ پہ گرہ، ناممکن
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

(کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ خدا!)

مارچ ۶۹ء

برخوردار جمشید کے نام

(علّامہ سے معذرت کے ساتھ)

کسی رئیس کے گھر میں قیام پیدا کر
دیارِ عشق میں اُونچا مقام پیدا کر
عمائدین کے مَل صُبح و شام روغنِ قاز
جو کوئی کام نہ ہو تو یہ کام پیدا کر
شجر کے نیچے ترنّم سے شعر پڑھ، کھو جا
جنابِ حُسن میں اپنا مقام پیدا کر

کسی وزیر کی لڑکی جو ہم سبق ہو تری
تو اُس سے راہِ سلام و پیام پیدا کر
جہاں سے جھانک سکے گرلز ہوسٹل کے بیچ
بلند اور بلند، ایسا بام پیدا کر
ترے طمنچے سے لڑکے بھی ماسٹر بھی ڈریں
اسمبلی کے الیکشن میں نام پیدا کر
یقیں ہو جیسے ہی، اب وارڈن نہ آئے گا
پسِ کُتب سے تو مینا و جام پیدا کر
بہ شغلِ ویڈیو، راتوں کو جاگ، دن کو سو
نئی صدی میں نئے صبح و شام پیدا کر
چرس میں ڈال لے تھوڑا سا آبِ ہیروئن
چلم کے واسطے تازہ قوام پیدا کر
دِشواز گر نہ مِلے، گڑ میں نیلا تھوتھا گھول
کشید کر کے مئے نیلی فام پیدا کر

فروری ۸۶ء

سار ی دُنیا کی نظر میں جاہلِ مطلق ہے گو
ایک دانش گہہ میں اُردو کا پروفیسر ہے وُہ
واہ یونیورسٹی کے ٹیچروں کا طمطراق
آؤ! زانوئے تلمذ تہہ کرو، جاہل بنو

لہ صوتی قافیہ۔

آئے دن کرتا ہے اپنی چیلیوں کے ٹھاٹھ وصل

یہ کوئی پہنچا ہوا مردِ خدا ہے، ہو نہ ہو

تھے دِوانے عقد پر، اب چکھ لیا اس کا مزہ

کیوں تمھیں چپ لگ گئی، کچھ منھ سے پھوٹو عاشقو!

زن کا چسکا ہو تو اک ناری نکیتن کھول لو

زر جو چاہو، دیس کی سیوا کرو، لیڈر بنو

گر بڑے صاحب کے کمرے تک رسائی چاہیے

پہلے چپراسی کے، پھر پی اے کے تم چمچے بنو

خود کو گر تسلیم کروانا ہو اُردو کا زعیم

چند بار امریکہ و برطانیہ کا حج کرو

گر نیا نقاد بننے کا تمھیں چرّائے شوق

کچھ عروض اور کچھ لسانیات کی باتیں کرو

گر سوئٹزر لینڈ میں کھاتا نہیں کھلوا سکے

ہو نہ ہو ٹٹ پونجیے تم سب، مخالف لیڈرو

دو دِوانے ایک سینگ آپس میں پھنسا کر یوں لڑے

جنگجو بکروں نے سوچا، ان کی شاگردی کرو

عمر بھر غزلیں کہیں، لیکن میں بے رس ہی رہا

نے کبھی شاہد پرستی کی، نہ چوما جام کو

دسمبر ۸۸ء

غزلیں

دسمبر ۱۹۳۷ء سے دسمبر ۱۹۴۷ء تک

لایا ہوں مَیں ازل ہی سے اک دردمند دل
پھر کیوں نہ پائے تیرے جہاں میں گزند دل
کیونکر شریک ہو یہ تری بزمِ عیش میں
رہتا ہے قید خانۂ ظلمت میں بند دل

دسمبر ۱۹۳۷ء

خونِ دل دل آنکھ سے جو بہا، تب ہوا سکوں
یعنی ہمارا سُود ہمارے ضرر میں ہے

ستمبر ۳۸ء

غالیچۂ دبیز نہیں چاہیے ہمیں
ہم کو ہے صرف سایۂ دیوار سے غرض

اکتوبر ۳۸ء

دیکھی جو مرے ساقیِ مخمور کی گردن
ترآ ہی گئی شیشۂ بلّور کی گردن

جنوری ۳۹ء

زندگی ہو گئی بے کیف وفورِ غم سے
جی نہیں لگتا اس آباد سے ویرانے میں
اللہ اللہ! یہ ہے کتنی منظم سازش
کوئی مسجد میں بھٹکتا ہے کوئی بتخانے میں

دسمبر ۳۹ء

دل میں جو فتنہ اُٹھا، پھر وہ سُلایا نہ گیا
امن اس شہر میں یارو، کبھی پایا نہ گیا

مارچ ۴۰ء

کس نے بے ہوش کر دیا مجھ کو
کیف بر دوش کر دیا مجھ کو
کس کے الفاظ میں یہ نغمہ تھا
ہمہ تن گوش کر دیا مجھ کو
ایک ہی بات نے ہمیشہ کو
سرد و بے جوش کر دیا مجھ کو

ستمبر ۴۱ء

قدم قدم پہ اگرچہ خودی کو ٹھیس لگی
گیا ہے یہ دلِ وحشت اثر ادھر پھر بھی
قیامِ دہر میں۔ جی بھر کے کیجیے کیا کیا!
بہت طویل ہو لیکن ہے مختصر پھر بھی

اکتوبر ۴۱ء

اے مرے تختۂ حیات! لہروں میں ڈگمگائے جا
لطف ہے جدّوجہد میں خطروں میں بھی گائے جا
بھیگ چلی ہے رات بھی وقت بھی ہے رُکا ہوا
مطربِ انجمیں نوا! ہاں یُونہی نے بجائے جا

نومبر ۴۱ء

چراغِ عمر بھی اے کاش جلد بجھ جائے
چراغِ دل ہی میں جب کوئی روشنی نہ رہی
نہیں ہے انجمن آرائی کی مجھے خواہش
کہ سازِ حرف میں اب کوئی دلکشی نہ رہی

نومبر ۴۱ء

اُدھر کا حال کیا معلوم مجھ کو
فلک کی بیچ میں دیوار بھی ہے
یہیں پر توڑ دوں کشتی کی پتوار
ہوا کا زور بھی منجدھار بھی ہے

ستمبر ۴۲ء

زمان و مکاں سب نظر کا ہے دھوکا
زمین و فلک کیا ہیں؟ دن رات کیا ہے!
جوانی کی کاوش کا پھل ہے ضعیفی
اجل! زندگی کی مکافات کیا ہے؟

دسمبر ۴۲ء

۱؎ یہاں تسکینِ اوسط سے مفتعلن کو مفعولن کر لیا ہے گو یہ مستحسن نہیں۔

کیونکر ہو سکے گا طے رات کا سخت مرحلہ[1]
ساتھ نہیں ہے بدرقہ، چھوٹ گیا ہے قافلہ

عشق بلند بال تھا، طنزِ خرد نہ سُن سکا
ایک نظر کی بات تھی، ہو گیا سارا فیصلہ

کون مقیدِ زماں، کون مقیدِ مکاں
فکر کی ایک جست نے توڑ دیا یہ سلسلہ

تیرے غلام بے شمار، مَیں ہُوں فقیرِ بے دماغ
بات کرُوں تو کس طرح، مُجھ سے تجھے ہے فاصلہ

اہلِ گُنہ کی بزم میں نبھتی ہے خوُب لُطف سے
واعظ و برہمن کے بیچ رہتا ہے کیوں محاذلہ؟

اکتوبر ۴۳ء

خاک پر بیٹھنے والوں سے یہ بے زاری کیوں
راہ میں تیری قبا پر بھی غبار آ پہنچا

گرچہ بدمست تھے ہم، چلتے ہی رہتے پھر بھی
کس لیے راہ میں یہ موت کا غار آ پہنچا

اکتوبر ۴۳ء

آج اس کے روپ اور آواز کی باتیں کرو
رات بھر بیٹھے اسی انداز کی باتیں کرو

کیا اٹھائی ہے یہ تم نے کافر و مشرک کی بحث
اس کی آنکھوں کی ادا و ناز کی باتیں کرو

---

[1] یہاں تسکینِ اوسط سے مفتعلن کو مفعولن کر لیا ہے گو یہ مستحسن نہیں۔

آتشِ سیّال و نغمہ کا پجاری کون ہے؟
نالۂ عاشق کے سوز و ساز کی باتیں کرو
چھوڑ دو، مشکل ہے یہ، اصلاحِ دنیا کا خیال
مہوشوں کے ناز کی، انداز کی باتیں کرو
کیوں صلاحِ کار کے غم میں تھکاتے ہو دماغ؛
بے خبر ہو کر نیاز و راز کی باتیں کرو
مجھ کو اہلِ دہر کی ہنگامہ آرائی سے کیا
آسماں کے اس طرف پرواز کی باتیں کرو

دسمبر ۴۳ء

طبعِ نازک کو نہیں برداشت فرطِ کیف بھی
بادۂ رز بھی اگر پیتا ہوں تو پانی کے ساتھ

جنوری ۴۴ء

خیالِ یار کی خوشبو کی موج بہنے لگی
ہٹاؤ شمع، مجھے نیند آئی جاتی ہے
عجب بہار پہ ہے آج حسنِ عفت سوز
خدا پرستوں کی سب پارسائی جاتی ہے
کہیں خموش ہوئی ہے زبانِ شاعر بھی
فضول تیغ برہنہ دکھائی جاتی ہے

فروری ۴۴ء

یارب! جہاں میں ہستیِ کامل بھی ہے کہیں؟
میری تگ و تلاش کی منزل بھی ہے کہیں؟
جا، اور زندگی کے ہر اک دشت و در میں دیکھ
جس میں نہ خارِ عشق ہو، وہ دل بھی ہے کہیں؟
اے کشتیِ شکستہ، بتا کیا جواب دوں؟
دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ ساحل بھی ہے کہیں؟
ہے زیست میں سکوں، نہ عدم خوابِ مستقل
تیرے گناہ گار کی منزل بھی ہے کہیں؟
جس کی روا روی سے ہے عالم میں رستخیز
اس ذرّۂ تپاں کا مقابل بھی ہے کہیں؟
مومن کے واہمے کی غلط کاریاں نہ پوچھ
بسمل بنا ہوا ہے وہ، قاتل بھی ہے کہیں؟

اپریل ۴۴ء

یہ تیری حکومت بھی حکومت ہے نرالی
اس میں کوئی شہری کہیں دلشاد نہیں ہے
کیا صبحِ ازل تو نے کوئی عہد لیا تھا!
میں کیسے کہوں! مجھ کو تو کچھ یاد نہیں ہے

اپریل ۴۴ء

صلاحِ کار کی صورت نظر نہیں آتی
مری بلا مرے دشمن کے سر نہیں آتی

وہ فصلِ بادشہی جس کو کہتے ہیں طفلی
جو ایک بار گئی، عمر بھر نہیں آتی
کوئی یہ پوچھے اَجل سے یہ کیا لگاوٹ ہے؟
ہمیشہ آنے کو ہوتی ہے، پر نہیں آتی

ستمبر ۴۴ء

ہوسٹل کی سمت یا رب! جھومتا آتا ہے کون؟
میرے نظّارے میں پیہم پھول برساتا ہے کون؟
بارہا میں نے سُنا ہے رات کو اے رُوحِ عصر!
اوس کے ہمراہ کچھ پیغام سا لاتا ہے کون؟
میرے اُٹھنے سے نہ ہوگی اِس جہاں میں کچھ کمی
کِس کو پروا ہے یہاں جاتا ہے کون آتا ہے کون؟
جیسے اس کے حلق سے بہتی ہو میٹھے رس کی نہر
شب کے سنّاٹے میں اس رعنائی سے گاتا ہے کون؟

اکتوبر ۴۴ء

وفورِ اشک سے ابرِ بہار ہیں ہم لوگ
کِسی گھر کے لیے بے قرار ہیں ہم لوگ
رُخِ زمیں پہ برنگِ غُبار ہیں ہم لوگ
اب اٹھ چلیں کہ ہر اک دل پہ بار ہیں ہم لوگ
اُٹھانا چاہیے آسائشِ جہاں سے ہاتھ
کہ آفتابِ سرِ کوہسار ہیں ہم لوگ

اکتوبر ۴۴ء

کوئی آتا ہے یوں مستانہ وار آہستہ آہستہ
بڑھے جس آن سے ابرِ بہار آہستہ آہستہ
تیری شیریں کلامی سے یہ فرحت ملتی ہے دل کو
چمن میں جیسے پڑتی ہو پھوار آہستہ آہستہ
اندھیری رات کی خاموشیوں میں غور سے سنیے
ہوا کچھ کہہ رہی ہے، بار بار آہستہ آہستہ

نومبر ۴۴ء

مرے دماغ کو ان اُلجھنوں کی تاب نہیں
خدا ہی جانے، خدا کیا ہے، ما سوا کیا ہے؟
چلو یہاں سے، فلک پر کریں چہل قدمی
یہ ہے خرابہ، خرابے کا دیکھنا کیا ہے؟
سرائے دہر میں چندے رہا، وداع ہوا
مفکرو! مری ہستی کا مدعا کیا ہے؟

دسمبر ۴۴ء

نظر میں گھوم رہی ہے وہ سبز و سُرخ بہار
ہوا سے جس کی ٹپکتا تھا شربتِ دیدار
گزر رہی ہے ندی، بنتی جاتی ہے تاریخ
فسانہ گوئی میں مصروف ہیں یہ لیل و نہار
ہزار تھپکیاں دیتی ہے اوس ذرّوں کو
شبِ حیات میں ممکن نہیں سکون و قرار

کوئی سُنائے مجھے آ کے وہ سُہانا راگ
کہ بھُول جائے بیابان میں بسنت بہار
سمجھ رہے ہو جسے خاکِ مردہ و تاریک
یہی زمین ہے دراصل شعلۂ دوّار
ٹپکنا چاہتے ہیں تارے اوس کے ہمراہ
زمیں کا جذبۂ دل شام سے ہے بر سرِ کار
بھڑک اُٹھے تو یہی پھُونک دیں گے تن میرا
دلِ فسُردہ میں ہیں جو بجھے بجھے سے شرار

اکتوبر ۵۴ء

ہَوا کی لڑکھڑاتی لہر ہے یا دَورِ جام آیا
زمانے کے لبوں پر کس کا مستی بیز نام آیا
ہُوا محسوس جیسے عالمِ امکاں ہے بے حاکم
حیاتِ عشق میں اِک بار ایسا بھی مقام آیا
تاثر شعر کا، جس کو خرد بے کار کہتی ہے
وہی نشو و نمائے رُوحِ دو عالم میں کام آیا
سرابِ عشق دُوری سے بہت فردوس منظر ہے
گیا تھا میں بہ صد امّید لیکن تشنہ کام آیا
نسیمِ صبح ایسے سنسناتی کان سے گزری
کہ جیسے عرشیوں کی سمت سے کوئی پیام آیا
نہ پوچھو بیشۂ مذہب میں کیسا ہُو کا عالم ہے
گیا جو بھی اُدھر امّید لے کر بے مرام آیا

مرا ذوقِ عمل، لے کر مجھے بڑھ ہی گیا آگے
اجل کہتی رہی "رُک جائیے، وقتِ قیام آیا"

نومبر ۴۵ء

زندہ دِلی فوت ہو گئی ہے
نغمے کی مَوت ہو گئی ہے

دسمبر ۴۵ء

یہ گلشنِ ایجاد ہے یا ظُلم کا گھر ہے؟
جو ذرّہ نظر آتا ہے وہ خاک بسر ہے
اے عمر! یہاں جی نہ لگا، محوِ سفر رہ
تو جس کو مکاں سمجھی ہے، وہ راہ گزر ہے
ہیں شام ہی سے لرزہ براندام ستارے
انسان کی بستی کی تڑپ کا یہ اثر ہے
کیا چیز ہے زاہد! سببِ گرمیِ محفل
عصیاں کی تجلّی ہے کہ یہاں کا شرر ہے!

دسمبر ۴۵ء

تو نے تو مجھ کو لاُمتناہی بنا دیا
کیوں کر ادا ہو تیری عنایت کا شکریہ
آتی ہے تیرے سائے میں کیا کیا ہوائے گل
میری نظر میں تو ہے گلستان سے سوا

اے حسن! تیری قربتِ ذہنی بھی سحر ہے
دل بھی مرا، دماغ بھی معصوم ہو گیا
آنکھوں میں صد ہزار ترنّم لیے ہوئے
یہ کون میرے دل کی طرف مسکرا دیا
جس کا طواف کرتے رہے مہر و ماہ بھی
کتنا بلند ہو گا اُس انساں کا مرتبہ
جس ذرّۂ خموش کا دل چیرتا ہوں میں
سینے میں اس کے سینکڑوں طوفاں ہیں بپا

دسمبر ۵۴ء

بڑے شکوہ، بڑی دُھوم سے شباب آیا
جہانِ ظاہر و باطن میں انقلاب آیا
مقامِ عشق کے نظّارے کا اثر مت پُوچھ
گیا میں ہوش بہ دامن، مگر خراب آیا
ہجومِ فکر سے یُوں نکلی شعر کی صورت
کہ بدلیوں کے جگر میں سے آفتاب آیا
یہ کون بندۂ گستاخ ہے، ہٹاؤ اسے
خُدا کے آگے، لیے شعر کی کتاب آیا

دسمبر ۵۴ء

گزر گئی ہے جہاں میں خُدا خُدا کرتے
عدم کے دشت میں رہ کر ہمیشہ کیا کرتے

جو لوگ ساری خدائی کی خاک چھانتے ہیں
کتابِ دل بھی کسی دن ملاحظہ کرتے
تمام عمر فقط موت کی دُعا مانگی
ترے جہانِ پریشاں میں اور کیا کرتے
پسند کر لیا ہم نے شعارِ محرومی
دیارِ غیر میں کس کس سے التجا کرتے
کُھلی ہوا سے کہا کرتے کوئی افسانہ
جہاں سے دُور اکیلے کہیں رہا کرتے

دسمبر ۴۵ء

کسی کو چین نہیں ہے، غمِ حیات بہت ہے
اندھیرے ہی میں گزارو، ابھی یہ رات بہت ہے
ہوا کرے جو ہے لا انتہا جہان کی وسعت
مرے خیال کو اِک جانِ کائنات بہت ہے
نہیں مجھے کسی سازِ نشاط و عیش کی حاجت
دماغ و دل کو سرورِ تصوّرات بہت ہے
رہائی، اور غمِ عشق سے، یہ دُور کی ہے بات
غمِ جہاں ہی سے گر مل سکے نجات بہت ہے

مارچ ۴۶ء

غمِ جہاں سے ہے بھرپور یہ جہانِ خراب
عجیب عشق میں ہے میرا قافلہ ستِ شباب

پڑے ہوئے ہیں جہاں موت کے شکستہ پَر
اسی زمین پہ کھلتے تھے تختہ ہائے گلاب

زمیں سے دُور ہیں یہ تارے، پھر بھی لرزاں ہیں
پیے ہُوئے ہیں یہ خونیں حیات کا تلخاب

خزاں نے آکے ہر اِک کا گلا دبا ہی لیا
ہر ایک پھُول پُکارا کیا شراب، شراب

فلک سے اوس ٹپکتی رہی ہے ساری رات
یہ کِس کے حال پہ تاروں کی آنکھ ہے پُرآب

دعائیں مانگا کیا، پھر بھی سادہ دل انسان
اگرچہ عرشِ بریں سے نہ آیا کوئی جواب

مئی ۴۶ء

حسنِ کامل کا سامنا ہے
اے دل! تیرا ہی آسرا ہے

کِس کے ہونٹوں کی یہ صدا ہے
آبِ نیساں برس رہا ہے

اے حُسن! تِری نگاہ کیا ہے
ذرّہ ذرّہ چمک گیا ہے

بجتا جاتا ہے سازِ ہستی
دیکھیں کب تار ٹوٹتا ہے

کتنے خوش رنگ، کتنے دُشوار
جذبوں کی کوئی انتہا ہے

ہر دل میں بسی ہے کوئی مورت
دُنیا بھی کوئی بُت کدہ ہے

کچھ حد ہے تری عنایتوں کی
زندہ ترے نام سے وفا ہے

اے خُلدِ نظر! جمالِ معصوم
کیا تیرے بھی واسطے فنا ہے؟

کوئی اُبھرے کہ ڈُوب جائے
دریائے حیات بہہ رہا ہے

افکارِ جہاں میں دب گیا عشق
سُورج پر ابر آ گیا ہے

غافل! انھیں توڑ پھوڑ بھی دے
انسان قیود میں بندھا ہے

فروری ۴۷ء

بہے جاتا ہے اپنی دُھن میں زمانہ
کوئی رو رہا ہو کہ گائے ترانہ

خلا میں یہ کیوں چھا گئی ہے اداسی!
سُناتا ہے کون اپنا غمگیں فسانہ؟

پڑا رہتا ہے دُور یاروں سے غافل
کِسی شخص کے پاس آنا نہ جانا

دسمبر ۴۷ء

نظمیں

یادِ وطن

ہے تلاطم خیز کتنا جذبۂ یادِ وطن
بحرِ غم میں ڈوبتا ہے کشتۂ یادِ وطن
مَیں بھی آلامِ غریبی سے ہُوں واقف جزو کُل
آج کل ہے میرا دل بھی خستۂ یادِ وطن

اگست ۳۸ء

صُبح کا چاند

آہ اے ماہِ سحر! کیوں رُخ ترا بے نُور ہے
اِس فروغِ نیم شب سے اب تو کیوں معذور ہے
سُوئے تاریکی ہے کیوں مائل ترا روشن چراغ!
جب کہ جویائے تجلّی ہیں یہ سارے کوہ و راغ
ابر کا ٹکڑا ہو جیسے۔ گر ہے تیری روشنی
یہ بھی ہے افسوس کوئی زندگی میں زندگی

میرا جینا بھی ترے مانند ہے ناپائدار
میرے یہ الفاظ ہیں نورِ خسِ آتش سوار
اس حیاتِ کم نفس میں آہ کیا کیا پائیے
شاخِ ہستی میں ذرا کھلیے کہ مُرجھا جائیے
دیکھ اپنی زندگی کی اے بشر! تصویر دیکھ
اپنے سر پر تار میں لٹکی ہوئی شمشیر دیکھ
کب سے اس خاکی قفس میں رُوح کا طائر ہے قید
آشیاں کی یاد میں فریاد کرتا ہے یہ صید
دَم بدم اس کو زیادہ شوق آزادی کا ہے
اور تیرے سر میں سودا خانہ آبادی کا ہے

اکتوبر ۳۹ء

عشق

کبھی وجہِ وجودِ دوجہاں عشق
کبھی غارت گرِ کون و مکاں عشق
نہ کیوں مجموعۂ ضدّین کہیے
کبھی راحت، کبھی سوہانِ جاں عشق

نومبر ۳۹ء

ساغرِ غم

دلِ آدمی نہیں دل، یہ ہے ایک ساغرِ غم
کہ بجائے مے ہے جس میں سمِ تلخ یعنی ماتم

یہ حیات عارضی ہے، دلِ غم زدہ کو لیکن
کوئی ثانیہ بھی اس کا نہیں روزِ حشر سے کم
دلِ آدمی خدایا! ہے مثالِ شیشہ نازک
تو ہی دل میں سوچ، کیونکر یہ سہے ضروب پیہم
ہیں ہجومِ رنج و غم کا متشکر اس لیے ہوں
کہ اسی سے ہو گئے ہیں مرے شعر نشترِ غم

دسمبر ۳۹ء

جوانی

جوانی کیا ہے: اِک فصلِ جنوں ہے
جوانی کیا ہے، بس نذرِ سکوں ہے
جوانی، جس میں دل آتش کدہ ہو
نفس کا تار، برق و صاعقہ ہو
جوانی کیا؟ جنوں، طغیان و جوشش
محبت، شعر، عصیاں، روگ، خواہش
جوانی، بزمِ دل کی نور افروز
نفس کو جو بنا دے ساز اور سوز
جوانی، جس میں دل محشر بنا ہو
درونِ سینہ ہنگامہ بپا ہو
جوانی کیا ہے عطرِ زندگانی
کہ خوشبوئے تمنا کی کہانی
نظر آتا ہے دل کے درمیاں عشق
زمین و آسماں پر حکمراں عشق

ہزار افسوس برآں زندگانی
کہ بے عشقِ کسے باشد جوانی

جنوری ۴۰ء

دعائے شاعر

بوقتِ شعر گوئی دل کا جو احوال ہوتا ہے
الٰہ العالمین! اس کو سرورِ جاوداں کر دے
جہاں کے درد کا داماں مرے شعروں میں پنہاں ہو
مرے حرفِ پُر افسوں کو مسیحائے زماں کر دے
دلِ لالہ کے داغوں کا سبب ہو جائے وا مجھ پر
حدیثِ بلبلِ وا فگارِ گُل کا ترجماں کر دے
عنادل چھوڑ کر رسمِ فغاں میری غزل گائیں
سخن میرا رموزِ شوق کو ایسا عیاں کر دے

نومبر ۴۰ء

شاعر کا نغمہ

فنافی الشعر و نغمہ ہوں، گنہ گارِ محبّت ہوں
مَیں سرتاپا وجودِ عاشقی ہوں، جوشِ وحشت ہوں
فدائے رنگ و بو ہوں مَیں قتیلِ آرزو ہوں میں
شہیدِ جستجو ہوں مَیں، ہلاکِ دردِ حسرت ہوں
مَن از بندِ مجازیات و مرئیات آزادم
کہ شورش ہائے دل را ساز و برگِ مدز باں دادم

مَیں اپنے دو جہاں تخئیل سے آباد کرتا ہوں
کبھی آباد کرتا ہوں، کبھی برباد کرتا ہوں

ٹھہر جاتا ہے گردُوں محو ہو جاتے ہیں سب تارے
کبھی جذبے میں گر راتوں کو مَیں فریاد کرتا ہوں

مجھے عادت ہے مرئیات سے آزاد رہنے کی
مَیں اوروں کو بھی مرئیات سے آزاد کرتا ہوں

مری پرواز سو پابندیوں کو توڑ دیتی ہے
مَیں سو پابندیاں ہر گام پر ایجاد کرتا ہُوں

مرے ہم مشربوں کی کس قدر قلّت ہے دُنیا میں
فلک کا رہنے والا ہوں فلک کو یاد کرتا ہوں

خیالِ برق تابے را بہ دل جلوہ کناں کردم
زمینِ شعر را از جلوہ ہایش آسماں کردم

دسمبر ۴۰ء

پیامِ عمل

تا کجا یہ خود فراموشی کا نشہ، تا کجا
ہوشیار و باخبر اے غافلِ صہبائے خواب

گنجِ زر و یرانۂ کوہ بیاباں سے نکال
چاک کر دے چہرۂ قدرت کے کے آگے سے نقاب

انتظارِ صبح کیا معنی، جو شب تاریک ہے
اپنے دل کے نور سے پیدا کر اپنا آفتاب

اگست ۴۱ء

نوجوان زاہد

(الہ آباد یونیورسٹی کے ایک زاہد ہندو طالب علم کا مرقع)

الٰہی! معجزہ ہے اس جوان کی عفت
یہ عمر اور یہ سارے جہان کی عفت
جوان ہوتے ہوئے ایسا کفر کرتا ہے
کہ نامِ عشق سے کانوں پہ ہاتھ دھرتا ہے
ہمیشہ خلوت و جلوت میں ایک سا ہے سماں
خدا کی حمد کا اک زمزمہ ہے وردِ زباں
فسانہائے کہن گنگناتا رہتا ہے
کہ جیسے دھار میں تسنیم ہی کی بہتا ہے
یہ زہدِ خشک ہے، وجدان کا ظہور نہیں
کہ اس کے سینے میں اک دل فروز نور نہیں
خلوص لاکھ سہی، لیکن آخر انساں ہے
نمودِ زہد کا بھی شائبہ نمایاں ہے
الٰہی! خیر ہو آخر یہ کیا نمائش ہے
ہماری قدر شناسی کی آزمائش ہے
خیال مُردہ، بدن مُردہ، قلب مُردہ ہے
یہ کیا؟ شباب کا آغاز ہی فسُردہ ہے
سراب زار میں گزرے جوانیٔ فانی
پلائیے کبھی اس کو شراب کا پانی
غرورِ زہد ہے دراصل پستیٔ کردار
ہمیشہ مستی و درندی کو پایا خوش اطوار

دسمبر ۴۱ء

اُلفتِ مادر

ہر مصیبت سے حفاظت ہے تری آغوش میں
ایک دُنیائے فراغت ہے تری آغوش میں

تیری اُلفت کوئی بچپن ہی سے وابستہ نہیں
کس زمانے میں تو میرے غم سے دل خستہ نہیں

جب کبھی امراض کے چنگال میں آتا ہوں مَیں
اور افکارِ پریشاں کُن میں کھو جاتا ہُوں مَیں

جسم ہی کیا، رُوح بھی ہو جاتی ہے بیمار سی
دہر کی ہر شے نظر آتی ہے کچھ بے زار سی

تب ترا الفاظِ تسلّی بخشتا ہے وہ سکوں
جس سے فوراً ختم ہو جاتے ہیں جذباتِ جنوں

دل کو صحت کا تیقّن معلوم ہوتا ہے قریب
ایک دُھندلا سا یقیں دیتا ہے کیفیت عجیب

جس کو عُرفِ عام میں کہتے ہیں ماں کی مامتا
اس زمانے کو دکھاؤں کیوں کر اس کا مرتبہ

کس طرح اس خاکداں میں اس شرر کا ہے وجود
یہ ہے اِک نورِ سماوی اور جہاں تاریک دُود

مہرِ مادر کس قدر بے لوث ہے، معصوم ہے
اس میں اپنے فائدے کی آرزو معدوم ہے

کس قدر پاکیزہ و پُرجوش و بے پایاں ہے یہ
رُوح کو آبِ زلالِ چشمۂ حیواں ہے یہ

کیا چکا سکتا ہوں مَیں ایثارِ مادر کا عوض
اِک بڑا احساں ہے اس کی ہر نگاہِ بے غرض
فخر کرنا چاہیے تجھ کو ہمیشہ اے زمیں
الفتِ مادر کے ہوتے تو فلک سے کم نہیں

دسمبر ۴۱ء

طفلکِ معصوم

اے نگاہِ طفلکِ معصوم! تجھ کو مرحبا
سحر و جادو ہے کہ مقناطیس ہے، تجھ میں ہے کیا
بچۂ ناداں! تری جس سے بھی آنکھیں مل گئیں
کیسا ہی وہ سنگ دل ہو سیدھی سوئے دل گئیں
خالیِ معنی نظر آتی ہے گو تیری نظر
اور ترے دل میں بہت کم ہے خیالوں کا گزر
تیری وہ مہمل نظر ہی کتنی طوفاں خیز ہے
دیکھنے والے کے دل میں کتنی مہر انگیز ہے
تیری آنکھیں کہہ رہی ہیں لہجۂ خاموش میں
چند گھڑیوں کے لیے لو مجھے آغوش میں
گو بظاہر صرف بھولے پن کا اک جلوہ ہے تو
آسمانی پھول ہے یا کوئی فرشتہ ہے تو
تو مبرّا ہے غرض مندی بھری تہذیب سے
تجھ کو کیا رشتہ ہماری صنعتی تخریب سے
آ کے اس دُنیا میں بھی گرویدۂ فطرت ہے تو
اور ہُنر کے شعبدوں کی سمت بے رغبت ہے تو

تجھ کو منعم اور مفلس کا نہیں کچھ امتیاز
تیرے آگے ایک ہیں دُنیا کے محمود و ایاز
کیا تجھے غم ہے کہ تو ہے بے زبان و بے سخن
تیری خاموشی مرے اشعار پر ہے خندہ زن
بغض و کینہ کے دھوئیں سے پاک تیرا سینہ ہے
تیرا دل اِک جگمگاتے چاند سا آئینہ ہے
تیرے نازک جسم پر آ جائے گر کوئی خراش
چوٹ کی شدت سے ہوتا ہے مرا دل پاش پاش
کس لیے بے فائدہ روتا ہے طفلِ شیر خوار؟
آہ چپ ہو جا کہ ہوتا ہے مرا دل بے قرار
جنوری ۴۲ء

کشاکش

نہ زندگی میں مزہ ہے، نہ موت کی خواہش
نہ بد دلی ہے نہ امید کی درخشانی
جمود اور حرکت دونوں سے ہے گھبراہٹ
سخن میں کوفت ہے اور خامشی میں یکسانی
مرے دماغ میں ہر وقت رہتی ہے اِک جنگ
سکون چاہیے اب، تا کجا پریشانی
مارچ ۴۲ء

شیطان

تاریک ہی تاریک نہیں پیکرِ ابلیس
خودداری و ہمت کا پیمبر بھی ہے شیطان
کیوں سجدہ کرے آدمِ خاکی کو وہ عرشی
آخر ہے فقط خاک کی ترکیب ہی انسان
خالق کی حکومت بھی نہ برداشت کی اس نے
ہم جنس کی طاعت ہے تجھے بھی کسِ شان
اِک بازوئے تنہا سے مقابل ہے خُدا کا
اللہ رے یہ ولولہ و حوصلہ، یہ شان
یزداں نہیں، شیطان ہے دُنیا کا محرّک
ابلیسِ خرد مایہ کی عظمت کو تو پہچان

جون ۴۲ء

تلاش

دیکھیے جس سمت، پیاسی لوٹتی ہے چشمِ عشق
اُف، جہاں میں حُسن کی کتنی کمی پاتا ہوں میں
دل کے اندر سوز بھی، آنکھوں میں بے چینی بھی ہے
یہ مگر ملتے ہی نہیں کیوں، برق برساتا ہوں میں
عارفو! میں ڈھونڈتا ہوں ہر طرف حسنِ مجاز
بے نظر ویران، دل کے آگے شرماتا ہوں میں
ہو گیا بے رنگ و بو کیوں یہ جہانِ رنگ و بو!
رنگ و بو! آ، تیرے پیچھے ٹھوکریں کھاتا ہوں میں

شوق ہے مجھ کو، مگر کوئی نہیں مقصودِ شوق
دیکھنے جاتا ہوں پر کیا دیکھنے جاتا ہوں مَیں؟
اُف تری کونین میں ہے کس قدر قحطِ جمال
دل لیے پھرتا ہوں اور دلبر نہیں پاتا ہوں مَیں

جنوری ۴۳ء

نیند

نیند کی لہر بھی کیا خوب چلی آتی ہے
خود بہ خود آنکھ مری بند ہوئی جاتی ہے
رات میں شعر کی تخلیق کا جب سودا ہو
آنکھ کو، دل کو اسی وقت یہ پڑ جاتی ہے
دل سے نغمات اُبلنے کو مُصر ہوں جس دم
ہونٹ پر قفلِ خموشی کا لگا جاتی ہے
دل کی خواہش ہے کہ اشعار میں خوں رووں میں
نیند چاہے ہے کہ چپ چاپ پڑا سووں میں

فروری ۴۳ء

مرگِ شدّاد

درِ ارم ہی پہ شدّاد کی قضا آجائے
کوئی بتائے کہ کیا یہ صریح جور نہیں
کسی کی آرزوں کے محل کو ڈھا دینا
ہے سچ تو یہ کہ یہ اربابِ دل کے طور نہیں

جو بجبر سوختہ کوئی وصالِ اول میں
بڑی ہوس سے دہن چومنے کو ہونٹ بڑھائے
غضب، ہزار غضب ہے، اگر اسی لمحہ
اجل کا پنجۂ سرد اس کی جان کو آجائے

فروری ۴۳ء

موسیقی

گرمیوں کی رات کی ٹھنڈک ہے کتنی خوش گوار
پھینک مارے جیسے گلدستہ کوئی ملکۂ بہار
تارے کم کم ہیں، کھلی ہے ہلکی ہلکی چاندنی
جسم کو دیتی ہے ٹھنڈک نیم شب کی چاندنی
نور کے ذرات سے ساری فضا لبریز ہے
چاند انساں کے دروں میں کتنا طوفاں خیز ہے
چاندنی کرتی ہے میرے دل میں جزر و مد بپا
چاند سے مل جانا میری آرزو کا منتہا
نیند کے کھیتوں سے آتی ہے نسیم بے خودی
ہے فضا رومانیت کی اوس میں بھیگی ہوئی

کون ہے یہ؟ کس نے چھیڑا ایسے عالم میں سرود
کس کے دل کی جھیل سے بہنے لگی نغمے کی رود
دل کی وادی میں اترنے لگ گیا کیدار راگ
آج شاید لوٹ جائے میرے جسم و جاں کی لاگ

عرش تک ساری فضا آواز سے لبریز ہے
ساز لے کر چاندنی خود آج نغمہ ریز ہے
سُر کا زیروبم پیاپے چھیڑتا ہے رُوح کو
اس سے کتنا چین ملتا ہے دلِ مجروح کو
نیند کرتی ہے فسوں، بہتی ہے جب ہموار لَے
جیسے دُنیا کی خموشی اور بھی بڑھنے کو ہے
محو ہو کر سوچنا بھی چھوڑ دیتا ہے دماغ
وقت رُک جاتا ہے، سو جاتے ہیں شہر و باغ و راغ
زیروبم میں راگ کے ہے کس قدر وارفتگی
ایک موسیقی مرے اندر بھی برپا ہو گئی
اپنی ہستی کو جلا کر شعلۂ آواز سے
جذبۂ دل کوئی افشا کر رہا ہے ساز سے
نیم شب کو نیند سے گھبرا کے ہے بیدار یہ
ڈھونڈتا ہے چین موسیقی میں، موسیقار یہ
ہو نہ ہو یہ بھی کسی کے حُسن کا دیوانہ ہے
لَے کا زیروبم تبھی تو اتنا بے تابانہ ہے

مئی ۴۳ء

خوابستاں

مجھے معاف کرے آنکھ نکتہ چینی کی
جو میری شاعری اس کو دکھائے دے ہلکی
جو الجھنوں میں پھنسے، وہ مرا دماغ نہیں
جو آبِ شور پلائے، مرا ایاغ نہیں

جمال ہی مرے اشعار کا ہیولیٰ ہے
کہ شعر حسن کی خاطر، مرا مقولہ ہے
وہ شعر ہی نہیں جس میں نہیں ہے شعریت
نہالِ شعر کی واحد زمیں ہے شعریت
دل اس زمیں پہ جب محوِ خواب ہوتا ہے
افق سے دُور کہیں تخمِ اشک بوتا ہے
تب اس دیار کی ایک آدھ بات کہتا ہوں
حجابِ شعر میں رازِ حیات کہتا ہوں
اسے زمانہ سمجھتا ہے شعر کا دیوان
دراصل ہوتے ہیں یہ واقعاتِ خوابستاں

مئی ۴۳ء

تارے کی لَو

تارے لَو دے رہے ہیں غافل — جیسے عاشق کا شعلۂ دل
کس زیبائی سے کانپتے ہیں — کرتے ہیں کیسے کیسے جھلمل
تارے لَو دے رہے ہیں غافل

بادل غائب ہوئے ہیں سارے — شفاف ہیں عرش کے نظارے
اوجی بھیگی ہوئی فضا میں — غافل! لَو دے رہے ہیں تارے
تارے لَو دے رہے ہیں غافل

بارش کا آج تار ٹوٹا — سیلاب سے آسمان چھوٹا
ثابت یہ ہو گیا جہاں پر — سُورج سچا ہے، ابر جھوٹا
تارے لَو دے رہے ہیں غافل

تارے ہیں یُوں دُور سے نظر بوس جیسے بجے دُور دشت میں کوس
منظر خنکی لیے ہوئے ہے بکھری ہے بھیگی رات میں اوس
تارے لَو دے رہے ہیں غافل

کالی برسات کی ہے یہ رات دامن میں لیے ہے آبِ ظلمات
مَیں تاروں کی چھاؤں میں پڑا ہوں ان میں بھی ہیں روشنی کے لمعات
تارے لَو دے رہے ہیں غافل

ستمبر ۴۳ء

حسینِ سفر

جیسے گناہ گار چلا جائے زیست میں
یُوں شب کے درمیاں سے گزر کر رہی ہے ریل
تند و کرخت غُل میں ترنم لیے ہوئے
میرے دماغ و دل پہ اثر کر رہی ہے ریل

بے غم ہے گرم و سردِ زمانہ سے اس کا دل
یکساں ہے اس کے واسطے پستی ہو یا فراز
کیوں کشتیِ بشر کی طرح ڈانوا ڈول ہو
بحرِ سیہ کے بیچ چلا جاتا ہے جہاز

میرے لیے اندھیری زمیں پر ہیں دام و دد
اس کی روش کے سامنے حائل نہیں کوئی
یہ عزم، یہ خروش، یہ پیہم رواروی
شاید کہ اس کی آخری منزل نہیں کوئی

یُوں دَوڑتی ہے رات میں وحشت کے ساتھ ریل
جیسے جھپٹتا ہو کوئی عفریتِ بد نما
گھاٹی ہو یا چمن، اسے چلنے سے کام ہے
اس کو مذاقِ دید سے بہرہ نہیں مِلا

اَے کاش یہ ہمیشہ یُونہی دوڑتی رہے
اپنے جنوں میں راہ چلے جائے بے سکُوں
سوتے رہیں تمام مسافر اسی طرح
مَیں اپنے ہم سفر کی جبیں دیکھتا رہوں
ستمبر ۴۳ء

اَندھیری دیوالی

جدھر بھی آنکھ اُٹھائیں، چراغ جلتے ہیں
جدھر بھی دیکھیے، شمعوں کے دل پگھلتے ہیں
گھروں کے دونوں طرف دیکھ کر دیوں کی قطار
ہوئی ہیں آنکھیں چکاچوند دل اچھلتے ہیں
زمیں کے نور سے تاروں کا اُڑ گیا ہے رنگ
یہ جھلملاتے ہیں، بجھنے کو ہیں، سنبھلتے ہیں
ہر ایک گھر کی چھتوں کی منڈیر پر ہیں دیے
دلوں کی لَو ہے کہ بچّوں کے دل مچلتے ہیں
ہر ایک شخص ہے کھویا ہوا صفائی میں
مکان کے خس و خاشاک سب نکلتے ہیں

ہے کتنی دھوم سے جاڑوں کا سب کو استقبال
تو اپنے دل سے بھی آلائش و غبار نکال

ہر ایک گوشۂ شب میں نکل رہا ہے دن
سیاہ رات سمائی ہے میرے گھر لیکن
یہاں میں ایک غریب الدیار ہوں تنہا
گرفتہ دل کہ چراغاں ہے کس طرح ممکن
میں کر رہا ہوں یہاں سیرِ کوچہ و بازار
اندھیرے گھر میں اندھیرے کو چھوڑ کر ساکن
مرے لیے بھی کبھی تھا یہ دن نشاط آور
مرا وجود، مری خواہشات تھیں کم سن
چراغِ دل جو بجھا ہے وہ جوش ہی نہ رہا
مری حیات ہے خود میری موت کی ضامن

ملال کیا ہے اگر ہوں میں خانماں برباد
مری بلا سے، اگر ہے مرا جہان آباد

الہ آباد۔ اکتوبر ۴۳ء

جوانِ مدرسہ

رہے گا اور رہے گا یہ مدرسہ آباد
کہ اس کی پیرِ کلیسا نے رکھی ہے بنیاد
ہر ایک گوشے میں سرخوش جوان پھرتے ہیں
چمن میں جیسے بہ کثرت صنوبر و شمشاد

کرشمے ان کے مرے دل کو چھین لیتے ہیں
ہزار نکتۂ دانش فریب انھیں ہیں یاد
تمام جسم پہ تہذیب کی تجلّی ہے
بہت ہی دل کش و دلبر ہیں مغربی صیّاد
نئی اکڑ، نئے تیور، نئی ہے آرائش
ہوس بھی شوق بھی ہے ان کی دید سے دل شاد

ملاحظہ ہو اس اٹھلائی چال کی یہ ترنگ
شرابِ ہند نہیں ہے، یہ ہے شرابِ فرنگ

نہ چاہتا تھا میں کہنا، مگر ہے یہ مشکل
کہ فطرتاً ہے بہت دردمند میرا دل
ہمیشہ مغربی بیچ درنج میں چور رہتا ہے
ہزار حیف! درِ غیر کا ہے تو سائل
تو اپنی وضع سے انگریز کو دکھاتا ہے
تجھے ہے اس کی حکومت سے رغبتِ کامل
بہ زور چھین لی اس نے ہماری آزادی
کم از کم اپنی رضا سے تو اس کی صف میں نہ مل
بدن تو شومیِ قسمت سے ہو گئے محکوم
تری نگاہ بھی ہے اس کی تیغ کی بسمل
ترا دماغ بھی، دل بھی غلام ہے افسوس
بتا، ہے یا نہیں، مغرب پرست تیرا دل؟
تو چاہتا ہے کہ ہو جائے کاش تو انگریز
مگر یہ رنگِ بدن راستے میں ہے حائل

تجھے الم ہے کہ تو ہند میں ہُوا پیدا
مجھے بھی غم ہے کہ تو ہند میں ہُوا پیدا

تجھے خبر نہیں شاید، ترا مقام ہے کیا؟
فرنگیوں کی نظر میں ہمارا نام ہے کیا
برس رہا ہے زمیں پر لڑائی کا تلخاب
جہاں کے زیر و زبر ہونے میں کلام ہے کیا
تباہیوں کی نئی صورتیں نکلتی ہیں
کسی قیامتِ صغریٰ کا انتظام ہے کیا؟
محال ہو گئی انسان کو بسر اوقات
یہ دلبری سے تری کوششِ خرام ہے کیا؟
رواں ہے کیسی نقاہت سے زندگی کا سانس
ذرا تو سوچ کہ یہ وقتِ احتشام ہے کیا؟
زمیں کے جسم کو ٹھنڈا پسینہ آیا ہے
وطن کے درد میں شرکت تجھے حرام ہے کیا؟

الٰہی! کر دے کسی تازہ دَور کی تمہید
مرے لیے نہیں زیبا فرنگ کی تقلید

دسمبر ۴۳ء

اِلقا

جب سراپردۂ افلاک میں دَر آتا ہُوں
طائرِ سدرہ کے شہپر کی خبر لاتا ہُوں

لوگ جس وقت سمجھتے ہیں مجھے محوِ خواب
ان کو کیا علم کہ مَیں خونِ جگر کھاتا ہُوں
بولنے لگتا ہے کونین کا ذرّہ ذرّہ
اس کے ہر حرف کو اشعار میں چھلکاتا ہوں
ہم زباں کوئی نہیں عالمِ آب و گِل میں
دوسرے مجھ کو، نہ مَیں ان کو سمجھ پاتا ہُوں

دسمبر ۴۳ء

وَضع داری

اے کہ تجھ کو ہے شکایت ستمِ منعم سے
آج اشراف بھی نالاں ہیں مثالِ مزدُور
یہی بہتر ہے نہ پُوچھ ان نجبا کی حالت
جو ہیں شہروں میں گروہِ متوسط مشہُور
صرصرِ جنگ نہیں لیتی ٹھہرنے کا نام
کر دیا اس نے ہر اک مست کا نشہ کافور
اچھے اچھوں کی اس آفت نے ہلا دی چولیں
واقعی آ گیا ترکیبِ عناصر میں فتور
یہ بہ ظاہر جو وضع دار بنا بیٹھا ہے
قرض کے دیر اثر سَم سے ہے نس نس بھرپُور
وضع سے دست و گریباں ہے نجیبِ سابق
اس کو جینے کی نہیں چاہ، مگر ہے معذُور
سادگی سے بھی ہے مشکل گزر اوقات اس کو
دل کو صدمہ ہے کہ مٹتا ہے شرافت کا غرور

اس کی عزّت ہے وہ بوسیدہ و کمزور مکاں
جس میں، برسات میں رہنے کو ہو کوئی مجبور
سو جگہ چھت کی درازوں سے یوں ٹپکے پانی
ہر گھڑی خوف کہ ہو جائے نہ تن چکنا چور

دسمبر ۴۳ء

فرار

جی چاہتا ہے غم گیں دُنیا کو چھوڑ دوں میں
اِک دوسرے جہاں سے اب رشتہ جوڑ لوں میں
بڑھتا ہی جا رہا ہے جو روزگار کا غم
اِک بار ختم کر دوں یہ بار بار کا غم
اہل و عیال کے ساتھ فکرِ معاش کرنا
دن بھر دوا دوِش میں راحت تلاش کرنا
انصاف کی کمی پر دن رات دل جلانا
برداشت کرتے رہنا عیاریِ زمانہ
اور مستزاد اس پر ہے جدّ و جہدِ قومی
کل لاٹھیاں چلی تھیں، کل گولیاں چلیں گی
ان آفتوں کے ہمراہ ایک اور غم ہے دل کو
ہے عشق کا مرض بھی اس قلبِ مضمحل کو
عشق و معاش مل کر پیچھے مرے پڑے ہیں
کتنے غنیم رستہ روکے ہوئے کھڑے ہیں

جی چاہتا ہے اِک دن سب سے فرار کر لوں
اک جست میں تذبذب کے پُل کو پار کر لوں

انساں سے دُور ڈھونڈوں چھوٹا سا اِک جزیرہ
اس خاکداں کی صورت جو ہو نہ تار و تیرہ
آب و ہوا جہاں کی اس طرح معتدل ہو
جس میں کبھی طبیعت بیکل نہ مضمحل ہو
اس سرزمیں کے اُوپر پا ئی نہ جائے بستی
اس سے پرے پرے ہو تہذیب زر پرستی
مانند راہبوں کے مَیں زندگی بِتاؤں
خس اور خاک لے کر اک کوٹھری بناؤں
بارش کا، دام و دد کا، جس میں گزر ہو مشکل
جاڑوں کا، گرمیوں کا، جس میں اثر ہو مشکل
دُنیا کا کوئی جھنجھٹ مجھ کو نہ چھیڑ پائے
تنہائی کے سکوں میں کوئی خلل نہ آئے
آجائے گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا
لگ جائے جس سے دل میں تانتا تخیّلوں کا
جاڑوں میں جس کے اندر تڑکے سے دھوپ آئے
بستر سے جو اٹھائے، سُستی کو جو بھگائے

ہو اِک بیاض سادہ اور اِک خیالِ رنگیں
شعروں کے آئنے میں دیکھوں جمالِ رنگیں

گھوما کروں ہمیشہ نیلے فلک کے نیچے
فیضان پائے صحت، فطرت کے عنصروں سے
چلنے سے ننگے پاؤں تلوؤں کی حس ہو زندہ
ڈھیلوں پہ یوں چلوں میں، جیسے اُڑے پرندہ

چشمے پہ جاکے پی لوں، پانی کی جب ہو خواہش
امواج میں بہادوں سارا غبارِ کاوش
پیچھے پڑے گا لیکن، ظالم بشکم وہاں بھی
لے آئے گا یہ مجھ تک دنیا کا غم وہاں بھی

پھل دار نخلِ تر ہوں، اے کاش اس زمیں پر
برسوں گزار دوں میں خود رَو پھلوں کو کھا کر

جنگل کے سارے باسی پہچانتے ہوں مجھ کو
میرا خیال رکھیں اور مانتے ہوں مجھ کو
مجھ سے ہلے ہوئے ہوں چوپائے اور پرندے
میری نظر کے آگے مسحور ہوں درندے
یوں میری جھونپڑی سے مانوس ہوں ہوائیں
ہر روز اس جہاں سے نغمے بہلکے لائیں
کانوں میں میرے آکر طرزِ نوی سے بولیں
فردوس گوش ہوکر اک تازہ بھید کھولیں
چڑیوں کے چہچہے سے کھل جائے آنکھ میری
سیلابِ شفق سے دُھل جائے آنکھ میری
دیکھا کروں مسلسل سورج طلوع ہوتے
وہ اک دہکتا گولا، وہ آبِ زر کے سوتے
وہ سُرخی شفق کا ہوجانا رنگ پیلا
سورج کی خیرگی میں وہ آسمان نیلا
وہ آسمان نیلا، وہ آسمان سادہ
فردوس کے جسد کا اک نیلگوں لبادہ

دیکھوں گا شام ڈھلتے سُورج کا ڈوبنا بھی
مدقوق رُخ پر اس کے کتنی چمک ہے باقی

آجائے گی اندھیری اپنا بھرا لے کر
آنکھوں کا ہوش لے گی دل کا سکون لے کر

بستر پہ لیٹ کر پھر دیکھوں سفید تارے
کچھ ڈرتے جھلملاتے، کچھ ہنستے پیارے پیارے
جیسے فضاؤں میں ہوں شفاف دل فرشتے
یا بھُولے نوریوں کے ہوں نور کے کھلونے
جب بعد نیم شب کے، آنکھیں کھلیں گی میری
باقی نہ ہو گی اُس دم آفاق میں اندھیری
تاروں کے جھمگھٹے میں سونے کا چاند ہو گا
سُورج بھی جس کے آگے غیرت سے ماند ہو گا
ہیئت سے انتہا کی حسرت برستی ہو گی
عاشق کے دل کے اندر حسرت ہی بستی ہو گی
یونان میں کہیں اِک کوہِ فلک نما ہے
چوٹی پر اُس کی، اِس کا محبُوب سو رہا ہے
یوں ہی نہیں نکلتا بے کار گھومنے کو
چلتا ہے چاند ہر شب، منہ اس کا چومنے کو
اوّل شبوں میں جب وہ، جاتا ہے بیچ ہی میں
پروانہ واپسی کا پاتا ہے بیچ ہی میں
جب اتنی دِقتوں سے اپنے قمر کو پائے
وا حسرتا اسی دم گلگونِ صبح آجائے!

القصّہ روز دیکھوں گا اس طرح قمر کو
مہتاب سے بھر دوں گا اپنے دل و نظر کو

اشعار تب کہوں گا جن میں ہو رامش و رنگ
گدلا نہ کر سکے گا حرفِ سیاست و جنگ
آزادی و غلامی کر پائیں گی نہ ہلچل
ہوگی مرے جہاں میں آزادیِ مکمّل
اے کاش جلد مجھ کو مل جائے وہ جزیرہ
جس کے سکوت میں ہو سُکھ چین کا ذخیرہ
اس میں سکونِ دل کا اتنا عدم نہ ہوگا
فکرِ شکم نہ ہوگا ، دُنیا کا غم نہ ہوگا

تنہائی کے اِرم میں بندش نہ ہوگی کوئی
تہذیب کے حرم میں بندش نہ ہوگی کوئی

لیکن نہ ہوگی ایسی وہ جنتِ خیالی
اس نخل میں بھی ہوگی ایک آدھ خشک ڈالی
اس حبسِ علائق میں ہوں نہیں اکیلا
میرے ہر ایک جانب ہے دوستوں کا میلا
احباب بھی بہت ہیں ، کثرت سے اقربا بھی
کیا آئے گی نہ دل کو یاد اُن کی اِک ذرا بھی
اس شہر سے نکلنا اِک زندہ خودکشی ہے
وہ زندگی بھی کوئی راحت کی زندگی ہے؟

لیکن غمِ جہاں کا لیتا ہوں جائزہ جب
دُنیا سے بھاگنے کو، پاتا ہوں جاں فزا تب

پھر کیوں نہ میرے مولا، اِک دن فرار کر لوں
کہتا ہوں بارہا جو وہ ایک بار کر لوں

دسمبر ۴۳ء

پرائی جنگ

جی میں آتا ہے کہ اس شاہنشہی کو پھونک دوں
جو پیے جاتی ہے مشرق کی تمناؤں کا خوں
کس قدر ہے بے حیا و پُرفریب و خود غرض
تھوپ ڈالا جس نے ہندوستان کے سر اپنا مرض
لڑ رہی ہے اپنے سر کوبوں سے خود تو روسیاہ
مجھ کو دعوت دے رہی ہے "تو بھی آ، ہو جا تباہ"
اہلِ زر کو بھی ہمارے ہو گئی مشکل گزر
کس قدر صحیح ہے "طویلے کی بلا بندر کے سر"
جب دیارِ غیر سے واپس وطن میں آئیے
قلبِ حاکم کی نخوست کا اندھیرا پائیے
پوچھتا کوئی نہیں مجھ سے سفر کی سختیاں
بہرِ استقبال ہے تازہ مصائب کا بیاں
میں مزاجاً ہوں خلافِ استہاب و التہاب
کہتا ہوں مجبور ہو کر: انقلاب وانقلاب

دسمبر ۴۳ء

غیبی عورت

وہ رات بھیانک تھی کتنی، ریتیلی آندھی آئی تھی
سنسان بیاباں میں ہو کر اک غیبی عورت جاتی تھی

بادل یوں پارہ پارہ تھے گویا وہ روئی کے گالے ہوں
جن میں سے چاندنی چھن چھن کر دھندلی پرچھائیں دکھاتی تھی

یہ ٹوٹی پھوٹی چاندنی تھی پُر ہول اندھیرے کے مانند
آندھی کے زناٹے میں یہ کچھ وحشت اور بڑھاتی تھی

پیڑوں کے تلے تاریکی میں بلتے تھے روشنی کے دھبّے
یا کوئی چتکبری ناگن جلدی جلدی لہراتی تھی

ایسے ویرانے کے اندر طوفانِ قیامت برپا تھا
وہ زور، وہ شور، وہ چلکاریں جن سے جاں لرزہ کھاتی تھی

یہ آندھی طرفہ آندھی تھی، چلتی تھی ہوا ہر جانب سے
گویش اپنا توازن کھو بیٹھے، اس طرح ہوا چلاتی تھی

چکّر کھا کر اُڑ پڑا اٹھتی، سن سن کرتی ہوئی زوروں سے
یا کوئی بپھرا سمندر میں ساحل سے آ ٹکراتی تھی

چنگھاڑ رہی تھی زوروں سے جھپٹے تھے گولوں پر گولے
اپنے ہر سانس سے متواتر پیڑوں کی ڈال گراتی تھی

پیہم وہ کڑک، ہر دم وہ دمک، وہ گھن گرج اور وہ چلاہٹ
سننے سے اس کے پھٹ نہ گئی، یہ امبر ہی کی چھاتی تھی

وہ چیخ پکار، وہ ہنگامہ، افلاک تھے جس سے زیر و زبر
کیا کوئی لڑائی کی دیوی اپنا نقارہ بجاتی تھی

پیڑوں سے ٹوٹ کے گرتے تھے پیہم ہتوں کے جھنڈ کے جھنڈ
شاخوں پتوں پر گر کے فنا اپنی تلوار چلاتی تھی
شاید خود قدرت آج کی شب مستی میں ہوش گنوا بیٹھی
چکر کھا کر گر جاتی تھی، ٹھوکر سے ریت اڑاتی تھی
اور یہ بھی ناممکن تو نہیں، دیوانی ہو گئی ہو فطرت
تھرّاتی تھی، چلّاتی تھی، تیہے میں شور مچاتی تھی
خاشاک و خزف یوں اڑتے تھے جیسے شاہیں پرواز کیے
طوفانی ساگر میں پاگل لہروں کو ناچ نچاتی تھی
جیسے کسی افسوں سے ڈر کر بھاگے جاتے ہوں بھوت پریت
پتوں کی فوج کو یوں سر اپنے آگے دَوڑاتی تھی
یا جیسے کسی سرکس کا شیر آجائے کٹہرے سے باہر
اس وقت جو بھگدڑ پڑ جائے خاشاک کو ایسے اُڑاتی تھی
پیڑوں کے دمادم گرنے سے ہوتے تھے دھماکے جو پیہم
یُوں روم کی شاہنشاہی کے گرنے کی یاد دلاتی تھی
اِس لمحہ جنگی نعرہ تھا، اُس لمحہ نالۂ و شیون تھا
جیسے کوئی شب خون پڑا ہو یا شورش جنّاتی تھی
یہ جنگ و جدال و کشت و خوں یہ حرب و ضرب و جوش و تروش
چنگیز، ہلاکو، نادر کا یہ قتلِ عام دِکھاتی تھی
گر یہ آندھی بڑھ سکتی تھی تو اور بڑھے جاتی تھی یہ
اٹھتی، گرتی، بڑھتی، چڑھتی، خود کو اُبھر یہ چڑھاتی تھی
یہ اُتار چڑھاؤ، یہ زنّاٹا، یہ دَم خم اور یہ فرّاٹا
یُوں باندھ رہی تھی اپنی ہوا، یُوں اپنا نقش جماتی تھی
دیوارِ آبی، کف بہ دہاں جس طرح جھپٹ کے بڑھتی ہو

یلغاریں کرتی آندھی یوں پیڑوں پر زور لگاتی تھی

ایسے میں کمال آسانی سے اک بوڑھی عورت جاتی ہے
شاید اس زال کی اصلیت کچھ خاکی کچھ جناتی ہے

خونخوار درندہ یا اژدر اگر کوئی اسے مل جاتا تھا
حیرت ہے کوئی اس کے آگے آنکھیں اوپر نہ اٹھاتا تھا
وہ اُلّو کا ہُو ہُو کرنا، انساں کی طرح شیون کرنا
جیسے جنگل کے حیوانوں کی موت کا نغمہ گاتا تھا
اِک گرگِ باراں دیدہ نے پیڑوں کے جھنڈ میں لی تھی پناہ
بے چینی سے گردش کرتا پیہم ہڈی چٹخاتا تھا
گر غور سے کان لگا کے سنو، اس غلغلۂ طوفانی میں
اِک جھینگر ثابت قدمی سے اپنی شہنائی بجاتا تھا
کچھ کچھ وقفے سے سب گیدڑ اِک زور کی ہانک لگاتے تھے
آندھی کا شور و شر لیکن ان سب کا مذاق اڑاتا تھا
اِک جھاڑی میں سے چمکتی تھیں دو نیلی نیلی سی آنکھیں
اک تیندوا، جھکڑ آندھی پر ناراضی سے غراتا تھا
ان ساری آوازوں سے بلند اِک ضیغم کا لینا وہ ڈکار
جنگل بادل سب بول اٹھے، کس زور سے گونج اٹھاتا تھا
کتنا پاگل تھا وہ ہاتھی جو ناکامی پر جھلا کر
برگد کا پیڑ گرانے کو ضربوں پر ضرب لگاتا تھا
پیڑوں کی دنیا کا حاکم، جنگل کا کالا ریچھ کہیں
شبنم کے تنے سے گھس گھس کر دانتوں کو سان چڑھاتا تھا
ان سب سے آگے بڑھ کے مگر اِک اعجوبہ ہی نظر آیا

خود عزرائیل جہاں آنے سے اپنی جان بچاتا تھا
چھتنار سے پیپل کے نیچے اِک غولِ بیابانی کا گروہ
بے ڈھنگے چکر کھا کھا کر ہاتھوں سے آگ اُڑاتا تھا
حیرت ہے کہ وہ اڑتا دریا، وہ صحرائی وحشی طوفاں
ان جلتے ہوئے انگاروں کو ہرگز ہرگز نہ بجھاتا تھا
لرزہ تھا اسرافیل کو بھی اس غیرتِ محشر طوفاں سے
آخر وہ بوڑھی کون تھی جو جاتی تھی بچ بیاباں سے

جنوری ۴۴ء

تاروں سے اُوپر

یہ کون سا دیس ہے خدایا کہ جس میں کوئی صدا نہیں ہے؟
کسی کو مَیں دیکھتا نہیں ہوں، کوئی مجھے دیکھتا نہیں ہے؟
فلک بہت پاس ہے یہاں سے لطیف بھی اور خوشنما بھی
دکھائی دیتے ہیں نیچے تارے مگر زمیں کا پتا نہیں ہے
حسین محراب کے دریچے، دکھائی دیتے ہیں دُور اُوپر
یہ کون کہتا ہے آسماں پر رسائی کا راستہ نہیں ہے
بلندیوں سے بکھر رہا ہے صبیح چہرے کا سا اجالا
زمیں مگر نیّرِ فلک کا دھواں یہاں پھیلتا نہیں ہے
یہاں کے ماحول میں بسی ہے صفائے ظاہر صفائے باطن
کثافتِ مادہ کی آلودگی یہاں تک رسا نہیں ہے
نفس نفس جگمگا رہا ہے، نگاہیں انوار سے بھری ہیں
سیاہیوں کا، کدورتوں کا نشاں کوئی اس جگہ نہیں ہے

عجب لطافت، عجب نفاست، عجیب نزہت، عجیب نکہت
صدا نہیں ہے، ندا نہیں ہے، فغاں نہیں ہے، بکا نہیں ہے
یہاں کوئی غلغلہ نہیں ہے کہ جس سے احساس چونک جائے
بشر کا بھی قہقہہ نہیں ہے، پرند کا چہچہا نہیں ہے
یہی طبق لامکاں ہے شاید، خلا اسی کو پکارتے ہیں
یہاں تو اک زندگی بھری ہے، یہ لامکان و خلا نہیں ہے
دماغ و دل پر بکھر رہا ہے کسی نئی کیفیت کا عالم
ہوس نہیں، آرزو نہیں ہے، خلش نہیں ولولہ نہیں ہے
فلک کے اوپر تو بستیاں ہیں وہاں تو ہنگامہ رہتا ہوگا
یہ کتنا اچھا مقام ہے جو سپہر کے ماورا نہیں ہے
ٹھہر گئی ہے یہاں پہنچ کر کہ ارتقا کی یہی ہے منزل
زماں کو ٹھہراؤ ہے، یہاں انقلاب کا سلسلہ نہیں ہے
عجب مقامِ رفیع ہے یہ، جمود بھی، زندگی بھی جس میں
وجود کا شائبہ نہیں ہے، عدم سے یہ آشنا نہیں ہے
ربودگی ہے مراقبے میں، کشادگی وجد کر رہی ہے
یہ روحِ انسان کا وطن ہے، قلمروِ مادہ نہیں ہے

جنوری ۴۴ء

آفتاب

مژدہ اے نادار! وہ نکلا افق پر آفتاب
قرمزی پُرنور ہاتھوں میں لیے اُم الکتاب
ٹھِٹھرِ ٹھِٹھراتی کانپتی سردی سے افسردہ نہ ہو
دھوپ گرماتی ہوئی آنے لگی باآب و تاب

اُف یہ سُورج جیسے دامن پر کسی کا اشکِ خوں
یا بھبوکا سا دہکتا آگ کا گولہ کہوں

اِک کنول کا پھول ہے اُوپر کو چڑھتا آفتاب
جس کے چاروں سمت ہیں پھیلی ہوئی امواجِ آب

اُس برہمن کی جبیں کا صندلی قشقہ ہے یہ
سادہ لوحی سے جو سمجھا ہے اسے نقشِ ثواب

کیا دمکتا جگمگاتا آفتاب ہے کوئی
یا سمندر میں تنِ تنہا جزیرہ ہے کوئی

کشتِ جنّت کا چمکتا خربُزہ ہے آفتاب
قدسیوں کی انجمن کا قمقمہ ہے آفتاب

یا کسی میدان میں بلّور کا قلعہ ہے یہ
یا کوئی آئینۂ صیقل شُدہ ہے آفتاب

جیسے چمکے فاصلے سے اِک پہاڑ الماس کا
یا کسی فانوس میں اُترا ہے جھاڑ الماس کا

کیوں نہ میں سمجھوں کہ موسیٰ کا یدِ بیضا ہے یہ
چشمۂ انوار کا سُکڑا ہوا منبع ہے یہ

کوئی زورَق سطحِ دریا پر ہوئی ہے نرم رَو
یا سمندر جھاگ کا سکڑا ہوا گچھّا ہے یہ

آسماں اِک بحر ہے، خورشید ہے جس کا حباب
یا تجلّی سے بھری، شاعر کے شعروں کی کتاب

یہ زرہ بکتر میں کوئی جنگ جو فوجی نہ ہو
کبر چہرے سے ٹپکتا ہے، اسے آمر کہو

اصل میں آزاد ہندوستان کا پرچم ہے یہ
تم اسے کتنا ہی دیہیمِ شہی کہتے رہو

اس قدر ضو جیسے ہو عشاق کے سینے کا داغ
ساری خلقت ہو گئی روشن بصر، روشن دماغ

بیچ میں کرنوں کے سُورج اُگ رہا ہے اس طرح
غسل سے آئے کوئی زلفیں بکھیرے جس طرح

زاہدِ بارِیش لگتا ہے شعاعوں کے سبب
جائے حیرت ہے، صبوحی کش ہوا ہے کس طرح

کیا حقیقت تو نہیں ویدوں پُرانوں کا بیاں
جا رہا ہے دیوتا کا رتھ گگن کے درمیاں

کوئی پیغمبر ہے یہ، آتی ہے اس سے حق کی بو
چشمۂ حیواں ہے یا، جس سے جہاں میں ہے نمو

جس کو پا لینا مِرے امکان کے اندر نہیں
کیا یہ سورج ہے مرادِ منتہائے آرزو

کائناتِ آب و گِل کا جگمگاتا دل ہے یہ
ہائے و ہُو سے فاصلے پر غیب کی محفل ہے یہ

الاماں یہ برف برساتی ہوئی ٹھنڈی سحر!
دست و پا کو سُن کیے دیتا ہے سردی کا اثر

نرم جھونکا بھی ہَوا کا چھید دیتا ہے جگر
لیکن اب آئی ہے اطمینان کی صورت نظر

چہرۂ خور دیکھتے ہی ہو گئی کافور ٹھنڈ
ریزہ ریزہ ہو گیا یخ بار کا سارا گھمنڈ

دھوپ نکلی اور سورج تن کو گرمانے لگا
سردیوں کے قلب کو کرنوں سے برمانے لگا
کرلباسی کا ذرا بھی غم نہ کھا اے بے نوا
قاقم و سنجاب کو خورشید شرمانے لگا

بڑھ گیا دورانِ خوں اعضا میں گرمی آگئی
قلب کی افسردگی ہے ختم، سردی کیا گئی
چشمۂ حیواں سے بڑھ کر شمس کی تابندگی
چھا گئی، لہرا گئی جلدِ بدن پر زندگی

اِک ذرا جو دھوپ میں آئے بدن کھلتا گیا
جسم میں گویا سرایت کر گئی رخشندگی

رات بھر شل تھا جہاں پھر منتشر ہونے لگا
زندگی کا ذرّے ذرّے میں اثر ہونے لگا

میرے سورج! زیستِ انسان و حیواں تجھ سے ہے
کھیت تجھ سے ہیں زمیں گلشن بداماں تجھ سے ہے
سارے دن کمرے میں گر رہیے تو مرجھا جائیے
ہو گیا ثابت فضائے دہر میں جاں تجھ سے ہے

اِک اندھیرا پھیل جاتا ہے ترے آنے کے ساتھ
نور کی گنگا رواں ہو گی ترے آنے کے ساتھ

ہو کے بے دم زندگی خوابیدہ ہے تیرے بغیر
حسنِ قدرت آنکھ سے پوشیدہ ہے تیرے بغیر
کون ہے دنیا میں جو بالیدہ ہے تیرے بغیر
کائناتِ خشک و تر بے دیدہ ہے تیرے بغیر

اُف جرائم اور عصیاں سے بھری تاریک رات
نور کے تڑکے ہوئی رخصت بلاؤں کی برات

جنوری ۴۴ء

گُرُگھَٹ دَیر

انوکھا ہی چلن ہے معبدوں کا
حرم سے بُت کدے کو پایا ابتر
بتوں میں کھو گیا ہے ایک بوڑھا
توجہ کر رہا ہے سب سے بڑھ کر
بھجن کرتا ہے اتنی زور سے یہ
کہ معبود اس کا شاید ہو گیا کر
سُنا کر ہی رہے گا آج اس کو
کہاں جائے گا بھگوان آج. بچ کر
جہانِ خستہ نے بھیجا ہے جیسے
بتوں کے پاس اپنی عرض لے کر
سُنانے کو سبھوں کے دل کا دُکھڑا
ہوئے یہ قبلہ و کعبہ مقرر

خدا سے آج منوا کر رہے گا
تبھی پیچھے پڑا ہے ہاتھ دھو کر
بڑھاتا جا رہا ہے اپنے سُر کو
چبھائے جاتا ہے نشتر پہ نشتر

یہ استغراق، یہ جذبہ، یہ مستی
نہ چونکے، گر بپا ہو جائے محشر
کس اطمینان سے مشغول ہے یہ
سکونِ قلب میں لپٹے سراسر
نہیں دُنیا و ما فیہا سے مطلب
نگہ اس وقت ہے افلاک منظر
جہاں سازی کے کیا کیا، ہتھکنڈے ہیں
بٹھالی دھاک کتنوں کے دلوں پر
یہ مدہوشی میں ہُشیاری تو دیکھو
خودی باقی نہیں ہے جو برابر
توجّہ منعطف کر لی ہے سب کی
عبادت کا ثمر پایا یہیں پر
پڑھے جاتا ہے فر فر بے تکلّف
اٹکتا بھی نہیں ظالم کہیں پر
تعجّب ہے کہ اس طوطے نے کیسے
کیے ہیں سنسکرت کے گیت ازبر

بڑا بھولا، بڑا معصوم ہے یہ
مگر آئینہ ہے رُوئے منوّر
یہ مکّاری، یہ حیلہ اللہ اللہ
خدا سے کھیل کرتا ہے ستم گر
ریا کاری ٹپکتی ہے نظر سے
چھپائے سے کہیں چھپتا ہے جوہر

پرکھتا ہے ذہانت کو جہاں کی
ہمارا امتحاں کرتا ہے کافر
خدا کے گھر میں بہکاتے چلا ہے
نہیں کم بخت کو اللہ کا ڈر
بڑا ہی گرگِ باراں دیدہ ہے یہ
بظاہر بندۂ مسکین و احقر
خدا مستی مبارک ہو اسی کو
مجھے کافی ہے اپنا دامنِ تر

جنوری ۴۴ء

رموزِ عشق

آتی ہے کیوں کسی کی یاد، درد کی اصلیت ہے کیا؟
حسن کی ماہیت ہے کیا، عشق کی ماہیت ہے کیا؟
صورتِ خوب دیکھ کر ہوتی ہے کیوں اثر پذیر؟
کس لیے ڈھونڈتی ہے آنکھ کوئی نظر فریب تیر؟
کوئی اگر حسین ہے، ہوتا رہے، میں کیا کروں؟
اے مری چشم ہرزہ گرد، کس لیے دل فدا کروں؟
عشق و ہوس کے درمیاں کس قدر اتصال ہے؟
کتنی لطیف یا کثیف آرزوِ وصال ہے؟
کہتے ہیں اتصال جسے، اس کا مطالبہ ہے کیا؟
جسم کی آنچ کی طلب، نام کو بھی روا ہے کیا؟

غور کیا ہے مدتوں میرے خیالِ خام نے
تب کہیں کچھ حقیقتیں آئی ہیں میرے سامنے

دیکھیے آپ گر کوئی شکلِ حسین و طرح دار
قلب و جگر کو دفعتاً رہتا نہیں کچھ اختیار
دل میں اُمنڈنے لگتا ہے ایک محیطِ آرزو
دیدِ حبیب کے لیے کرتی ہے آنکھ جستجو
یاد جو اس کی آئے گی، دل میں اُٹھے گا درد سا
آنکھ بنے گی سُرخ سی، چہرہ بنے گا زرد سے
ہے یہی عرفِ عام میں عشق بہ اوّلیں نگاہ
لیکن اسے بقا نہیں، یہ نہیں پائدار آہ
ایک گھڑی کو دیکھیے عمر میں جس کو ایک بار
کیسے کرے گی اس کی یاد دل کو ہمیشہ بے قرار

عشق بہ یک نگاہ کو جانیے اِک شرارِ خس
جلد ہی جو بھڑک اُٹھے، راکھ ہے بعدِ یک نفس

اور ہی چیز ہے وہ عشق، ساتھ رہے جو عُمر بھر
دل سے جسے نہ دھو سکے وقت کا، ہجر کا اثر
گر کسی خوبرو کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہو
ہو کہ نہ ہو بہت حسیں، وضع میں خوش مذاق ہو
ناز ہو جس کو حُسن پر، طبع میں دلبری لیے
اپنے ہر ایک حرف میں تحفۂ زندگی لیے

پائیے گا شروع میں، اس کا قربِ دل فریب
ہاتھ میں ہوگا آپ کے، آپ کا دامنِ شکیب
وقت گزرتا جائے گا، دل یہ فسوں دکھائے گا
جب وہ نظر سے دُور ہو اس کا خیال آئے گا
بیٹھے بٹھائے ایک دن، ہوگا معاً یہ انکشاف
دل میں بسا ہوا ہے عشق اوڑھ کے اُنس کا غلاف
روز بروز، خود بخود، بڑھتا رہے گا عشق پھر
تازہ بلا کا منتظر، تازہ بلاؤں پر مُصِر

آئے گا رفتہ رفتہ جو، ہوگا وہ عشق مستقل
اس کے ترشحات سے سبز رہے گی کشتِ دل

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہے یہ مرا مشاہدہ
ایک نہ ایک دن ضرور، عشقِ بشر کو ہے فنا
اپنے بہارِ ناز سے دُور جو رہیے کچھ برس
عشق نکل ہی جائے گا چھوڑ کے قلب کا قفس
جیسے گزرتا جائے گا دوست کا دل رُبا شباب
دھیما ہوتا جائے گا آپ کے عشق کا رُباب

آج ہے جس کے نام پر عشق کی رُوح بے قرار
بعد میں رہ سکے گی بس، دوستیِ خلوص دار

؎ اس نظم میں دو جگہ سکونِ اوسط کا زحاف لگا کر مفتعلن کو مفعولن کر لیا گیا ہے گو یہ مستحسن نہیں۔

کہنے کو شاعری کے بیچ عشق کے مدّعی ہیں سب
راستہ جانتے نہیں، عشق میں اجنبی ہیں سب
دِل نہ لگائے اور سے؟ دیکھے نہ ایک کے سوا!
دل کے لیے ہے اتّقا، سخت ترین مرحلہ
آنکھ ہر اژدحام میں، ڈھونڈتی ہے جمال کو
دل کو اگر ہے شوقِ حسن، کیجیے کیا خیال کو
ایسے کئی حسین ہیں، دبدبہ جن کی پُر سکوں
کہتی ہے لذّتِ ہوس، میں انھیں دیکھتا رہوں
دل کو جمال کی تلاش، ہو وہ کسی مقام پر
خواہ دورانِ مدرسہ، خواہ سرِ رازِ بام پر

حُسن جہاں بھی جائے گا، عشق پہنچ ہی جائے گا
شمع کے نُور پر پتنگ آئے گا اور آئے گا

دیکھ کر اچھی شکل کو گاہ یہ سوچتا ہوں میں
جن کا غلام ہے جہاں، کون سے وہ نکات ہیں
اس کے بدن کی سطح پر کون سا وہ کمال ہے
حُسن کی ماہیت بہت اُلجھا ہوا سوال ہے
کر نہ سکا میں فیصلہ، رُوح کو جستجو ہے کیا
دوست سے چاہتے ہیں کیا، عشق کو آرزو ہے کیا
کیوں کسی دوسرے کی سمت کھینچتی ہے خود بخود نگاہ
دل کو ملے جہاں شکست، کون سی ہے وہ رزم گاہ

اپنی خودی کو چھوڑ کے ہوتے ہیں غیر کے غلام
اپنی ہتک کے باوجود کرتے ہیں اس کو شاد کام

کاش مجھے کوئی بتائے عشق کی اصلیت ہے کیا
عشق کی اصلیت ہے کیا، حسن کی ماہیت ہے کیا

فروری ۴۴ء

ترغیبِ انتقام

تو کس لیے نہیں ہے شرافت سے بہرہ مند
نادان زندگی ہے ترے فکر سے بلند
تجھ سے مجھے گلہ ہے تو خود دار کیوں نہیں
کیونکر تجھے قبول ہے اغیار سے گزند
قربان کیوں ہو ان کی خوشی پر ترا وقار
تو دوسروں کے واسطے ہے کس لیے سپند
افسوس تو نہ جان سکا اپنا مرتبہ
اغیار ہی رہے تری نظروں میں ارجمند
شاید تجھے خبر نہیں اے ذرۂ زبوں!
تیرے خزینے میں ہیں کئی مہر و ماہ بند
گو گر گیا زمیں پہ، نہیں تجھ کو اعتراف
کوتاہ دست اپنے عزائم کو کر بلند

اللہ کا غضب ہے کہ تو چونکتا نہیں
تیرے گلے میں ڈال رہا ہے کوئی کمند
کیوں تجھ کو جوشِ کار نہیں آ رہا ہنوز
سب سے پچھڑ گیا ہے ترا منکسر سمند
افسوس! ہو تی ہے تری توہین ہر جگہ
کڑھتا ہے ذلتوں پہ تری قلبِ درد مند
اب چاہیے کہ شانِ جلالی کا ہو ظہور
کب تک سُنے گا ناصحِ مشفق کا وعظ و پند

حاجت میں دوسروں سے مدد کے لیے نہ کہہ
ناکامیاب رہ مگر اپنی ہتک نہ سہہ

اُٹھ اور لے زمانۂ جابر سے انتقام
اے شخصِ پائمال! تجھے نیند ہے حرام
جب جانتا ہے تو کہ ترا حق ہے حریّت
کرتا ہے کیوں بہ جبر ستم گر کا احترام
کر دیتا ہے مجھے یہ تصوّر ہی آب آب
ہندی جوان چند سفیہوں کا ہو غلام
اے بے خبر! حیات ہے تلخاب تند و تیز
تو نے سمجھ لیا تھا اسے قند کا قوام
گر بازوؤں میں زور نہیں اس کا غم نہ کر
معذوریوں کا ہوتے رہے گا کچھ انتظام
جوشِ نوا سے خانۂ صیاد پھونک دے
ہمّت ذرا سی چاہیے شعلہ نفس حمام

اے شخص جد و جہدِ مسلسل ہے زندگی
دستِ جفاکشی میں ہے کونین کی لگام
بیٹھے بٹھائے جان پہ خطرات مول لے
تلوار کھینچ، توڑ دے تلوار کا نیام
گر جا عدو پہ صاعقہ و برق کی طرح
میدان سے کبھی نہیں پلٹا تو بے مرام
انجام کا خیال خطائے عظیم ہے
کچھ غم نہیں جو بعد میں رہ جائے تلخ کام
اخلاقیات و دین اگر بزدلی سکھائیں
راہِ عمل میں ان کو بھی کر دُور سے سلام

توہین جو کرے تری اس کو اجاڑ دے
غیرت ہے تو عدو کی بُن و بیخ اکھاڑ دے

فروری ۴۴ء

طرب زار

دلِ ستارہ میں شرابِ ناب دیکھتا ہوں میں
شراب دیکھتا ہوں میں، شراب دیکھتا ہوں میں
طرب برس رہی ہے آج اوس کے حجاب میں
خنک خنک ہواؤں میں شباب دیکھتا ہوں میں

فضائے سرو و ماہتاب زمزموں میں محو ہیں
فرشتہ و پری کو مستِ خواب دیکھتا ہوں مَیں

قرار میں بدل گئیں تمام بے قراریاں
فسُردگی کے ہاتھ میں رباب دیکھتا ہوں مَیں

نگاہِ ذرّہ ذرّہ سے اُبل رہا ہے دُودھ سا
زمیں کی سطح کو فلک جناب دیکھتا ہوں مَیں

غمِ جہاں سے بے نیاز ہو کے مست ہے جہاں
جسے بھی دیکھتا ہُوں مَیں خراب دیکھتا ہُوں مَیں

زمیں کی سمت جھک رہا ہے سر خوشی میں آسماں
اسے بھی زندگی سے بہرہ یاب دیکھتا ہوں مَیں

نگاہِ آدمی کی تشنگی کی آنچ خیرہ ہو
نگاہِ حور میں ایاغِ آب دیکھتا ہوں مَیں

دکھائی دے رہے ہیں کچھ نہال تمکنت لیے
جمال کے شباب کا جواب دیکھتا ہُوں مَیں

یہ دیوتا کھڑا ہوا جو پڑھ رہا ہے کچھ فسُوں
مزاجِ دو جہاں میں انقلاب دیکھتا ہُوں مَیں

فروری ۴۴ء

ابلیسؔ اَور حُور

ابلیس:

اُف بڑی ویران ہے، سنسان ہے تیری بہشت
کِس طرح تنہائی سے مانوس ہے تیری بہشت

حُور:

کیا کہوں روزِ ازل سے ہے یہی میرا مکاں
دل کو لگتا ہے بھلا اپنے وطن کا خوب و زشت

ابلیس:

جستجو کے ذوق سے محروم ہے اس کا وجود
رُوح سے بے گانہ ہے یہ منزلِ الماس و خشت
یہ ترے رُخسارِ سوزاں، یہ ترا چھٹتا شباب
عشق سے واقف نہیں تو، بے ثمر ہے تیری کشت
اُف یہاں بھی حُسن ہو جذبات سے ناآشنا
بے گنہ تیرا تخیل، بے صنم تیرا کنشت

حُور:

اے ہمہ داں، تو نے پہچانا نہیں عورت کا دل
انتظارِ شہریارِ خشک و تر قلیم بہشت
باغباں آئے گا میرے گلستاں میں ایک دن
ہے یقیں مجھ کو کہ تابندہ ہے میری سرنوشت
خرّم آں روزے کہ وہ سلطانِ دَوراں آئے گا
کرّ و فر سے میرے نظّارے میں انساں آئے گا

ابلیس:

تجھ کو کیا معلوم، کیا ہے ابنِ آدم کا مزاج
غالباً اس کو نہیں تیری ارم کی احتیاج
کیا تجھے اللہ نے اب تک بتایا ہی نہیں
ہو گیا ہے عالمِ اسباب پر شیطاں کا راج

اب وجودِ خلد پر کوئی یقیں کرتا نہیں
ساتھ مُلّا کے گیا وہ سعیِ جنّت کا رواج
جو فریبِ دین و دوزخ میں تھا کل تک مبتلا
ہو گیا ہے خود شناس و ہوشیار و مست آج
فکرِ عالی نے دکھایا ہے اسے یہ رنگ ڈھنگ
اس کا قابو ہو تو لے ڈالے خُدا سے بھی خراج
آب و گِل کے شعبدے میں لگ گیا ہے اس کا جی
خشک و تر کا ذرّہ ذرّہ دے رہا ہے اس کو باج
انگلیوں پر اِک زمانے سے نچاتا ہوں اِسے
دیکھنا کچھ دن میں دستورِ جہاں ہوگا مزاج
سوگ کر، باغِ اِرم ویران رہ جانے کو ہے
آدمی کی سادگی کا، میری ضد کا کیا علاج؟

حُور:

یہ نہیں طے کر سکی اب تک میں اے خلّاقِ شر
تو زیادہ ظلم پیشہ ہے کہ آدم کا پسر

مارچ ۴۴ء

چاندنی کا راگ

زمیں کو چاند کی لہروں نے کیا پُرنور کر ڈالا
ہَوا میں گر رہے ہیں آبِ زر کے سیکڑوں جھرنے
یہ جیتا جاگتا جادُو کیا مدہوش منظر نے
زمیں کے فرشِ خاکی کو مثالِ طُور کر ڈالا

نہ ہوتی چاندنی تو ایک اندھیری چھا گئی ہوتی
جمالِ عالمِ فانی نگاہوں سے چھپا ہوتا
میں دُنیا کو ہمیشہ کی طرح بے رنگ ہی کہتا
سیاہی کی نحوست مجھ کو اب تک کھا گئی ہوتی

مہینہ مارچ کا اور رات کا پچھلا پہر ہے یہ
ہوا کے ساتھ مینھ برسا تھا اوّل رات زوروں سے
بہارِ گل میں کیونکر آ گئی برسات زوروں سے
بہت ہی خوب لگتا ہے، دُھلا نکھرا قمر ہے یہ

ہَوا بھیگی ہوئی ہے، رات بھیگی، آسماں بھیگا
قمر کے نور سے تارے پریشاں جھلملاتے ہیں
بالآخر اوس کے قطرات بن کر ٹوٹ جاتے ہیں
نظر آئے نہ کیوں پھر چاندنی کا بادباں بھیگا

نکھر کر ایک بارش سے ہوئی ہے چاندنی ایسی
نہا کر جس طرح کوئی چنبیلی سا بدن چمکے
اور اُس بھیگے بدن سے بوند ٹپکیں اوس سی چھمکے
کبھی اس رات سے پہلے ہوئی ہے چاندنی ایسی!

مرے اللہ یہ کیوں اس طرح گانے لگی کویل
مری ہستی میں گھلتا جا رہا ہے خوش گلو نغمہ
ترنم ریز ہے جیسے مجسم آرزو نغمہ
کیے دیتا ہے میری فکر کو یہ زمزمہ بیکل

اُفق سے تا اُفق ہر شے کے اُوپر چھا گیا نغمہ
بڑی تیزی سے بہتی ہیں ہوا کی خوش نما لہریں
اُچھلتی ڈوبتی لہریں، مچلتی جاں فزا لہریں
چلا آتا ہے دامن پر ہوا کے تیرتا نغمہ

فضا آواز کی بوندوں سے یوں لبریز ہے امشب
یکایک چاند جیسے بدلیوں میں سے نکل آئے
زمین و آسماں کے درمیاں تب نُور بھر جائے
سنہری چاندنی شاید ترنّم ریز ہے امشب

جہاں میں اس طرح یہ زمزمہ ہے جاری و ساری
مرے سر میں بھرے ہوں ابخراتِ فکر جس صورت
چمن میں صبح دم بکھری ہوئی ہو جس طرح نکہت
دلِ مشتاق میں جیسے ہوں جذباتِ وفاداری

بڑا ہی رس بھرا لگتا ہے یہ سُر کان کو اس دَم
برستا ہو فلک سے شہدِ صافی دَم بدم جیسے
کیا کرتی ہے شبنم صفحۂ گلشن کو نم جیسے
اترتا جا رہا ہے سردِ شربت حلق میں پیہم

سُنائی دیتا ہے یہ راگ یوں کچھ دُور سے آ کر
کوئی پیغام بر ٹیلے پہ جیسے وعظ فرمائے
درائے کارواں کی گونج جیسے گاؤں میں آئے
کوئی دہقان جیسے کھیت گھیرے رات کو گا کر

ابھی پَو پھٹنے کو ہے، ٹوٹتا ہے خواب کا جادو
نظر آتی ہے ذرّاتِ ہوا کی نیند برہم سی
کوئی طرّار بچّہ اُٹھ گیا سو کر سحر دم ہی
کیے جاتا ہے کوئل کو چڑانے کے لیے کُو کُو

مِری نظروں میں یہ مہتاب اِک پاکیزہ نعمت ہے
کھِلی ہے چاندنی میرے کمینے ہوسٹل میں بھی
چمک جاتی ہے افلاک کی ضیا غارِ راجل میں بھی
تجلّی زار ہونے سے خرابہ رشکِ جنّت ہے

اُٹھا ہے اک جوانِ خوبصورت اس قدر تڑکے
سہانی صبح کو یہ صرف پڑھنے میں گزارے گا
مقیّد ہو کے کمرے میں کتب سے جان مارے گا
خُدایا! کیا ستم ڈھاتے ہیں اپنی روح پر لڑکے

کشش باقی نہیں اس کے لیے مہتاب میں کچھ بھی
توجّہ ہی نہیں کرتا یہ کوئل کے ترانے پر
توجّہ ہی نہیں کرتا یہ اس کے روٹھ جانے پر
نظر آتی نہیں اس کو تڑپ سیماب میں کچھ بھی

کتابی علم کب تک آدمی کا خون چوسے گا
تجھے فطرت بلاتی ہے غموں سے دے گی چھٹکارا
ادھر آ چاندنی میں پھینک دے کاغذ کا پشتارا
نہالِ تازہ! یہ مُردہ کتابیں پڑھ کے کیا لے گا

پسپائی

اُڑتی نظر سے آج ذرا میرا حال دیکھ
توہین جو نہ سہہ سکا اُس کا مآل دیکھ

دل پر مرے وفورِ تمنّا سے داغ ہیں
جلتے ہیں اور منو نہیں، یہ وہ چراغ ہیں

کتنے دنوں سے آہ، اسیرِ بلا ہوں مَیں
اِک کلبۂ سیاہ میں لیٹا ہوا ہوں مَیں

ہمّت سے میں نے کام لیا جو زمانے میں
سب ہاتھ ایک ہو گئے مجھ کو گرانے میں

مَیں اپنے دشمنوں کی غلامی نہ سہہ سکا
شکرِ خدا کہ دل مرا آزاد رہ سکا

مکّاری و فریب و دغا کے خلاف ہوں
میری خطا یہ ہے کہ طبیعت کا صاف ہوں

اب کیا ہوَس کروں کہ طبیعت ہی بجھ گئی
ہر روز غم بدلتا ہے شکلیں نئی نئی

عزّت سے دن گزارنا دشوار ہے یہاں
چلنا ہے، اور راستہ پُر خار ہے یہاں

نومبر ۴۴ء

(الہ آباد یونیورسٹی کے جین ہوسٹل میں وہاں کے حکّام کے خلاف بغاوت کرنے پر مَیں ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد تین ماہ تک قے اسکالر کے طور پر شہر میں کمرہ کرائے پر لے کر رہا۔ یہ نظم انھیں دنوں کہی گئی۔ اس کے بعد مجھے بدرجہا بہتر سر پی سی بنرجی ہوسٹل میں جگہ مل گئی۔)

زبوں حالی

ہم نشیں! واقعی نفرت کا سزاوار ہوں مَیں
کیوں نہ اس زیستِ بے رنگ سے بے زار ہوں میں
گر کسی کے لیے نوروز ہے یہ، ہونے دو
زندگی مجھ سے تو کہتی ہے شبِ تار ہوں میں
اے زمیں! زور لگا میرے مٹانے کے لیے
تیرے دامن میں کھٹکتا ہوا اک خار ہوں میں
اے فلک! اب بھی مِری بیخ کنی ہو نہ سکی؟
تیرا دیرینہ گنہ گار و خطا کار ہوں میں

تو خبردار نہیں میری زبوں حالی سے
پارہ پارہ ہوں میں ایّام کی پامالی سے

کتنا خوں خوار ہے اس دہر کا آئیں اے دوست
کیا تعجب ہے اگر رہتا ہوں غمگیں اے دوست
پہلے میں بھی تھا بھی کچھ، مگر اس کا کیا ذکر!
اب تو اک جملۂ بے کس کی ہوں تزئیں اے دوست

جابروں کی ہے فقط خام خیالی، ہمدم!
میں نہیں ہونے کا پابندِ قوانیں اے دوست
دل بہت ڈوبنے لگتا ہے جب اندیشوں میں
کسی امّید سے ہو جاتی ہے تسکیں اے دوست

کچھ دنوں بعد، مساوات کا دَور آئے گا
مجھ کو واثق ہے یقیں، آئے گا اور آئے گا

نومبر ۴۴ء

زندگی دشوار ہے

کیوں مشیت اِک گدا کے درپے وآزار ہے
وہ تو بے چون و چرا مرنے کو خود تیار ہے
ایک دل ہے جس کے اوپر غم کا اتنا بار ہے
تو بھی غافل! زندگی سے کس قدر بیزار ہے

زندگی دشوار ہے

بے غذا کاہیدہ ہوتا جا رہا ہوں دم بدم
چوستا رہتا ہے دل کی تازگی کو مارِ غم
کچھ عجب بے رنگ سی رہنے لگی ہے چشمِ نم
دشمنِ جاں ہیں ہزاروں، اک تہی غم خوار ہے

زندگی دشوار ہے

میری آنکھوں میں نقوشِ گردشِ ایّام دیکھ
ابنِ آدم کس قدر ہو سکتا ہے ناکام، دیکھ
میرے میخانے کا ساماں، ایک ٹوٹا جام دیکھ
کون کہتا ہے اسے گُل؟ یہ سراپا خار ہے

زندگی دشوار ہے

شاخ پر مرغِ خوش الحاں کر رہا ہے چہچہے
چھیڑتے ہیں زخمِ دل کو منعموں کے قہقہے
ہم سدا تاروں کی آنکھوں میں کھٹکتے ہی رہے
اپنی قسمت سوئی ہے، چشمِ فلک بیدار ہے

زندگی دشوار ہے

خون پینے کو نہیں کچھ کم وبالِ روزگار
اس پہ طرّہ ہے کسی انساں کی چاہت کا خمار
زندگی کا ذرّہ ذرّہ ہو گیا زار و نزار
جسم ہی خستہ نہیں کچھ، رُوح بھی بیمار ہے
زندگی دشوار ہے

بُجھ گیا دل، اب طبیعت کی روانی کیا کروں؟
مر رہا ہوں، ہائے اے جوشِ جوانی کیا کروں؟
تجھ سے شرمندہ ہوں میں اے زندگانی کیا کروں
مَوت سے کیسے مدد مانگوں کہ دل خود دار ہے!
زندگی دشوار ہے

دسمبر ۴۴ء

انتظار

کاش اس وقت کہیں سے مرا دلبر آ جائے
مسکراتا ہوا، اُف اس کا شگوفہ سا دہن
دیکھ کر جس کو مرے دل کی کلی کھِل جائے
کھولے بیٹھا ہُوں میں ایوانِ محبت کے کواڑ
تھک گئی آنکھ مری راستہ تکتے تکتے
پاؤں کی چاپ کی آواز مگر آتی ہے
آہ یہ بھی ہے کوئی راہروِ بے گانہ
اس سے کیا حال کہے میرا دلِ دیوانہ
ایک سایہ نظر آتا ہے سڑک کے اُوپر
اُف یہ کیا! یہ بھی کوئی دوسرا انساں نکلا

شام کے پانچ بجاتی ہے گجر کی آواز
وقتِ موعود کو یہ آخری سانس آتی ہے
ٹمٹماتی ہوئی امید فنا ہوتی ہے
اب بھی تو وقت کا پابند نہیں ہے اے دوست
تیرے نزدیک تو یہ بات ہے معمولی سی
تو یقیں جان، مری جان پہ بن آئی ہے
دن چھپا جاتا ہے، شام ہوئی، اٹھ اے دل
در کی جانب سے میں اب آنکھ ہٹا لیتا ہوں
کوئی امید نہیں، اب وہ نہیں آئے گا
نہیں آئے گا

دسمبر ۴۴ء

فیض کی نظم "تنہائی" سے متاثر ہو کر۔

تاروں کا دیس

میں نے موسیقی سے پائے ولولے
دل تخیل کی حدوں سے بڑھ گیا
ایک دریا تھا کہ بانسوں چڑھ گیا
پھٹ گیا میدان، آئے زلزلے

زیر و بم نے دل کو بے کل کر دیا
اک کسک ہونے لگی بے اختیار
خواہشوں نے کھٹکھٹایا بار بار
بے قراری کو مکمل کر دیا

دل سے رخصت ہو گیا دنیا کا غم
کیا لیے پاؤں نکل کر چل دیا
یوں ہوا کا رُخ بدل کر چل دیا
آ گئی دل میں مسرت ایک دم

ہو گیا ماحولِ ہستی دل سے محو   یک بیک اڑنے لگا دل سوئے افق
ساتھ میں سیال جلوے قوسِ قزح   ہو گیا احساسِ پستی دل سے محو

چلتے تاروں کے کچھ اوپر رک گیا   معتدل پُروائیاں آنے لگیں
رُوح کو انگڑائیاں آنے لگیں   یہ طبق دل کے لیے بھی ہے نیا

گر رہے ہیں مستیوں کے آبشار   زمزمے اک سمت کرتے ہیں خرام
ہاتھ میں تھامے ہوئے پھولوں کا جام   میری جانب دیکھتے ہیں بار بار

کچھ پرندے کر رہے ہیں چہچہے   گر رہے ہیں چونچ سے قطراتِ زر
جو لڑھک کر بنتے جاتے ہیں گہر   یہ پرندے بھی کہاں آ کر رہے

پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی سی پھوار   لہر لیتے ہیں فضا میں رنگ و بو
جیسے بَل کھائے کسی کا صاف مو   وہ مُوِ تاباں جو کر دے بے قرار

زور باندھا خواہشوں نے اس گھڑی   ہو گئی مست و سیہ مست آرزو
زور سے بہنے لگی ہر آب جو   مجھ پہ یہ افتاد اچھی آ پڑی

دل کو اک خوش زلف یاد آنے لگا   سب پرندے زمزمے گانے لگے
عرش والے پھول برسانے لگے   چرخ پر رنگِ شفق چھانے لگا

دسمبر ۴۴ء

بیمِ و رجا

دل کو اب تک وہ سیہ بختی کے لمحے یاد ہیں
جن دنوں میں اِک اندھیرے گھر کا صاحب خانہ تھا
ہر در و دیوار سے چمٹی ہوئی تھیں حسرتیں
جس میں گردِ غم نہ ہو، ایسا کوئی گوشہ نہ تھا
بے دلی، افسردگی کی زندہ لاشیں ہر طرف
کس قدر سنسان وحشت خیز وہ ویرانہ تھا
رُوح کی مُرجھائی آنکھوں میں بھرا تھا اضطراب
جسم کا ہر ذرّہ اطمینان سے بے گانہ تھا
وہ مچلتا شوخ جلوہ، جس کو کہتے ہیں ہنسی
اِن لبوں کے واسطے بھُولا ہوا افسانہ تھا
ہار کر ہمت کنارہ کر گئے سب غم گسار
اس بھرے پھولے جہاں میں کوئی بھی اپنا نہ تھا
کیا قیامت کی تھی مجبُوری کہ زر رکھے باوجود
بھوک میں غم کے علاوہ اور کچھ کھاتا نہ تھا
ناگہاں دوزخ کے پنجوں سے رہائی ہوگئی
اِک نئی شاداب دُنیا میں رسائی ہوگئی
وہ جہانِ تازہ جس میں بس رہی ہے زندگی
جس کے ہر ذرّے میں ہے خورشید کی تابندگی
ایک سمت آرام جلوہ کر رہا ہے ناز سے
کیاریوں میں اینڈتے ہیں نوجواں انداز سے

جھومتی ہے، لڑکھڑاتی ہے یہاں موجِ ہوا
جگمگاتے سُر نکلتے ہیں ہر اک آواز سے
واہ وا. کیا کیا نفاست سے کھِلی ہے چاندنی
جاں میں جاں آنے لگی اس نغمۂ بے ساز سے
چشم و دل کے واسطے ہے جاں فزا یہ شہرِ حُسن
بیچ میں لہرا رہی ہے ڈگمگاتی نہرِ حسن
دیکھ اے دل، چین کرنے کا مقام آ ہی گیا
سخت دل تقدیر کے ہونٹوں پہ جام آ ہی گیا
دیر سے جس باغ کا در بند تھا میرے لیے
اس کے گُل چینوں میں آخر میرا نام آ ہی گیا
گلستاں میں آ گیا ہوں بیشۂ پُرخار سے
آ گیا ہے دیدہ ور، کہہ دیجیے گلزار سے

جنوری ۵۴ء

فانیِ حُسن

قریبِ ختم ہوئی رات، چاند ڈھلنے لگا
مرے بدن پہ سے ہٹتی ہے چادرِ مہتاب
اندھیری پھیلتی آتی ہے مُردنی کی طرح
مچل رہے ہیں مرے اشک، آہ فانیِ حسن
بس ایک رات ہی میں تیرا دم نکلنے لگا

جہانِ برق و شرر میں فنا تجھے بھی ہے
خدا کے واسطے اس جَور کو مٹا ڈالو

مری طرف سے فنا سے کوئی کرے درخواست
کہ اپنے پنجۂ خونیں سے حُسن کو نہ چھوئے

اپریل ۵۴ء

ضعیف ماں

تقدّس لیے ہیں یہ بے نور آنکھیں
چراغِ حرم، مشعلِ طور آنکھیں
جہاں مٹ چکے حسرتوں کے نشاں بھی
تمنّا سے بے گانہ، مجبور آنکھیں

اپریل ۵۴ء

جمود

اے تنِ آسانی، کہاں تک لگ گیا ہے دل کو زنگ
چاندنی راتوں میں بھی اٹھتی نہیں کوئی امنگ
اب نہ کوئی یاد آتا ہے، نہ ہوتی ہے خلش
میرے پہلو میں وہی قلبِ جہندہ ہے کہ سنگ؟
سرد جوشی، کاہلی، درماندگی، مُردہ دِلی
ان سے تو اچھی تھی فریادِ تمنّا کی ترنگ
اے تغیّر، اے تغیّر! یاد ہیں وہ دن مجھے
ہر نفس جب قلب میں رہتی تھی ارمانوں سے جنگ

ستمبر ۵۴ء

تارے کا چراغ

یہ بکھری چاندنی رات
یہ بکھرتی ہوئی اوس

چاندنی خوب کھلی ہے گرچہ
پھر بھی کچھ تارے نظر آتے ہیں

سامنے ہے کوئی ننھا سا دل
جھلملاتا ہوا روشن تارا

اوس سے دھل کے فلک آئینہ ہے
جا بجا تارے جڑے ہیں جس میں
جگنوؤں کا کوئی بَن ہو جیسے

وہ ستارہ، مرے دل کے مانند
کس لیے کانپ رہا ہے اتنا
غمِ الفت سے یہ بیگانہ ہے
اس کے چہرے پہ نہیں سوزِ عشق

شاید اس کو ہے خیالِ انجام
صبح دم اس کو بجھے جانا ہے
اس نے دیکھی ہیں فنا کی آنکھیں
خون کا جام چڑھائے بدمست

ٹمٹمانا جسے کہتے ہیں ہم
زندہ رہنے کی ہے یہ جدّ و جہد

آخرش آئے گی بادِ سحری
اور بجھ جائے گا تارے کا چراغ
آہ زنجیر میں جکڑی ہوئی زیست!
آہ بیچارہ و مجبور کی موت!

ستمبر ۴۹ء

پروازِ شعر

رات کے تین بجاتی ہے گجر کی آواز
اپنے بستر پہ میں بے فکرِ جہاں لیٹا ہوں
آنکھ کے آگے اندھیرا ہے، بدن غرق لحاف
لیکن افکار کے نظارے نظر آتے ہیں
کر رہا ہے بڑی مستی سے مرا دل پرواز
جتنے تارے ہیں وہ سب نیچے رہے جاتے ہیں
لامکاں میں بھی کئی رنگ نظر آتے ہیں
اُف یہ کیا! چار کے بجنے کی صدا آتی ہے
وقت کس تیزی و سرعت سے بہا جاتا ہے
چند ہی شعر سرانجام ہوئے ہیں اب تک
تھک گئے شہپرِ دل اتنی سی پرواز کے بعد
یک بہ یک نیچے اتر آیا زمیں کی جانب
دوسری نیند نہ کیوں لے لوں ذرا دیر کو میں
صبح کے پانچ بجاتی ہے گجر کی آواز

دسمبر ۴۵ء

رات کا مہمان

دمک رہی ہے بہت آج کی اندھیری رات
ہر ایک ذرّۂ تاریک میں ہے رنگ و بو
سمٹ گئی مرے کلبے میں نو بہارِ جہاں
فضا کے دوش پہ ہیں کیسی کیسی خوشبویات

زمانہ خوابِ اجل میں ہے محو، ہونے دو
مری نگاہ کے آگے حیات جھومتی ہے
لپک کے ایک فرشتے کے ہونٹ چومتی ہے
خدا کے واسطے اس موجِ گل کو سونے دو

وہ میہماں ہے میرے غریب خانے میں
مری نگاہ کے آگے کھِلا ہوا ہے چمن
مری گرفت میں آ کر رہی بہارِ عدن
وفا کا نام ہے موجود اس زمانے میں

سُنائی دیتی ہے یہ کس کے سانس کی آواز
کہ جس سے کرنے لگی وجد کائنات کی روح
ہزار جوئے ترنّم جلو میں اپنے لیے
ادائے ناز سے بہتا ہے نغمۂ بے ساز

کشید کر کے کئی خوش گوار راگوں کو
سمو دیا ہے کسی نے نفس کے نغمے میں
جہاں کا سب سے حسیں راگ، شاعری کی جان
جہان والو مرے پاس آؤ، اس کو سنو

مرے کلیجے میں اک کپکپی سی آتی ہے
شراب کا وہ سمندر دکھائی دیتا ہے
اُبھر رہا ہے گپھاؤں سے اس سمندر کی
وہ راگ، جس سے مجھے نیند آئی جاتی ہے

جہاں میں ایک بھی انسان، آہ، ایسا نہیں
بتا سکوں میں جسے بھید تیری چاہت کا
کسے خبر ہے کہ جاڑوں کی شب کے تین بجے
لکھی ہے کس کے لیے میں نے یہ حدیث بدیں

دسمبر ۴۵ء

جگر داری

کھڑی ہوئی ہے مرے آگے ہاتھ باندھے ہوئے
ادب سے آنکھ جھکائے، جہان کی عظمت
نہ جانے کب سے مرے سر کے گرد گھومتی ہے
سنہرا تاجِ درخشاں لیے ہوئے شہرت

جہاں کے بازوئے خستہ میں اتنا زور نہیں
مری بلندیِ پرواز میں جو حائل آئے
کسی کے روکے، نہیں رُک سکے گا میرا عروج
یہ کہہ دو حاسدِ بد بیں سے، خاک میں مل جائے

جو دیکھتا ہے مرے عزمِ آہنی کا شکوہ
فلک بھی، چاند بھی، سورج بھی کانپ جاتا ہے
زمیں کے سینے پہ ہے میری تمکنت کا پہاڑ
جبینِ دہر پہ ٹھنڈا پسینہ آتا ہے

یہ تھے جو چند عناصر مخالف و سرکش
شکست مان گئے میرا سامنا کرتے
مری اُٹھان زمانے کو دیتی ہے للکار
جو مجھ کو روک سکے، روک لے وہ جی بھر کے

دسمبر ۴۵ء

چاندنی

ہائے یہ جاڑوں کی راتیں اور نکھری چاندنی
صحن میں، گلزار میں، سڑکوں پہ بکھری چاندنی
یہ چمکتے نجم، یہ مہہ اور نیلا آسماں
آج آتا ہے نظر ہندوستاں جنت نشاں

چاندنی کو دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا ہوں میں
اس زمینِ خاک سے بیگانہ ہو جاتا ہوں میں

جنوری ۴۶ء

حسنِ خوابیدہ

یہ کیسا پھول مرے سامنے مہکتا ہے
چمک رہا ہے سیہ آدھی رات کا آنچل
ضیا فروش ہے جیسے زمین کا ہو چاند
زمین والوں کے دل میں نہ کیوں مچے ہلچل

یہ پھول ہے کہ اُجالا ریاضِ رضواں کا!
یہ پھول ہے کہ مرے دل کی زندگی غافل!
زمیں پہ نور ہے، تاروں کی آنکھ میں مستی
بھری ہوئی ہے ہواؤں میں شاعری غافل

افق سے جیسے نکلتا ہے آگ کا گولا
دمکتا اور دہکتا شراب کے مانند
دمک رہی ہے متانت سے حسن کی صورت
سفید و سُرخ مہکتے گلاب کے مانند

خموش رات میں جس وقت سوتے ہیں تارے
فرشتہ اور پری اس کے گرد گھومتے ہیں

نہ جانے کتنی حیا دار حوروں کے جذبات
مرے خدائے محبت کے ہونٹ چومتے ہیں

یہ ہونٹ، جن میں بسی ہے شفق کی رنگینی
مہکتے پھولتے لالے کی پنکھڑی جیسے
یہ لہلہاتی جبیں زلف کی پھبن سے لڑے
عدم کے بیچ بہے نہرِ زندگی جیسے

نسیم سرد طراوت کے ساتھ بہنے لگی
تھپک رہا ہے کسی کو یہ سرد سا جھونکا
مہک رہی ہے لطافت سے نیند کی وادی
خموش بہتا ہے خوابیدہ حسن کا دریا

لیے ہے کیفِ بہاراں، یہ گل فروش بدن
رخِ جمیل پہ کیا کیا امنگ چھائی ہے
کھڑا ہوا ہوں دریائے بے خودی کے بیچ
دل و دماغ میں کیسی ترنگ چھائی ہے

حیاتِ شعلہ بداماں کا آخری دن ہے
کہ میرے واسطے دیدار اس کا ممکن ہے
اندھیری شب میں چھپا ہے زمانِ مستقبل
نہ ہونا چاہیے مایوس دل کو، لیکن ہے

جہاں میں کون ہے جو حسنِ یار کو یہ بتائے
کہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے ہیں عشق
کھڑا ہوا ہے فراقِ دوام مُنہ کھولے
نہ جانے کس کے سہارے جیے ہوئے ہے عشق

اپریل ۴۶ء

ھجر کی پہلی رات

جتنے تارے ہیں سبھی اِک زمزمہ گانے لگے
اپنے شیشوں سے جہاں پر عطر برسانے لگے
دیوتاؤں نے سنبھالے اپنے نورانی ستار
چل پڑی دھرتی کی جانب دودھ سے نغمے کی دھار
رات کا پچھلا پہر اور اِس قدر ٹھنڈی ہوا
روحِ گرما کے لبوں پر بھی تبسم آگیا
اس طرح کچھ بہہ رہی ہے یہ نسیم سرد و مست
گھومتا ہو جیسے آوارہ خیالِ مئے پرست
کھول ڈالا زینتِ مہتاب نے اپنا بادباں
بازوئے دل کے سہارے کرتی ہے سیرِ جہاں
ایسا موسم، ایسی رات اور عالمِ تنہائی ہے
یہ ہوا بیتے دنوں کی یاد لے کر آئی ہے
اس ہوا سے آگیا روحِ جہاں کو ارتعاش
اس کو بھی رہنے لگی شاید کسی شے کی تلاش
آہ میری رُوح کو بھی ہے کسی کی جستجو
گُلستانِ عشق سادہ ہے بغیرِ رنگ و بو

کتنی دلکش ہے ہوا، پر اس سے راحت پائے کون؟
میرا دل بے چین ہے، آ کر اسے بہلائے کون؟

اپریل ۴۶ء

تنہائی

ٹھٹک گیا ہے اندھیرے کے درمیاں کوئی
خلا ہے چاروں طرف اور گہرے گہرے غار
نہ سامنے ہے کوئی راستہ، نہ پیچھے ہی
نہ کوئی راہ نما ہے، نہ کوئی ہم راہی

اگست ۴۷ء

شامِ آزادی

کر دو اعلان کہ اس وقت سے آزاد ہیں ہم
آرزو جس کی تھی صدیوں سے وہ دن آ ہی گیا
مژدۂ حرّیتِ قوم سنایا ہی گیا
کہہ دو عالم سے کہ آزاد ہیں، دلشاد ہیں ہم

ہم کسی غیر کی مرضی کے نہیں اب پابند
ظلم کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو رکنا ہی پڑا
آخرِ کار ستم گار کو جھکنا ہی پڑا
ٹکڑے ٹکڑے نظر آتی ہے تشدد کی کمند

دُھل گیا آج رُخِ قوم سے لعنت کا داغ
شادمانی سے ہر اک چہرہ کھِلا جاتا ہے
ہر طرف جشن کا سامان نظر آتا ہے
جگمگاتے ہیں شبستانوں میں عشرت کے چراغ

آج پھولوں سے مہکتی ہے ہماری وادی
تختۂ خاک چمن زار بنا ہے امروز
ہر شجر مطلعِ انوار بنا ہے امروز
ذرّے ذرّے میں ہے رقصانِ شررِ آزادی

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء

کتنے مجبور ہیں ہم

زندگی موت کے مانند نظر آتی ہے
پنجۂ یاس میں ہیں کتنی تمنّائیں اسیر
جو سسکتی ہیں، تڑپتی ہیں، گھُٹی جاتی ہیں
خون سے جن کے فضا سرخ ہوئی جاتی ہے
ان کی تسکین کو کچھ کر بھی نہیں سکتے ہم
زیست بے کیف سہی، مر بھی نہیں سکتے ہم
اپنی منزل سے ہمیشہ کی طرح دور ہیں ہم
کتنے مجبور ہیں ہم

شبِ تاریک ہے، کہنے کو اگرچہ دن ہے
راستہ کوئی سجھائی نہیں دیتا ہم کو
دست و پا ہی نہیں کچھ، سوچ بھی مفلوج ہے اب
سب کو ممکن ہے جو، اپنے لیے ناممکن ہے
بے گل و برگ یہ گلزار رہے گا کب تک؟
دلِ بیمار تو بیمار رہے گا کب تک؟
اپنی معمولی مرادوں میں بھی معذور ہیں ہم
کتنے مجبور ہیں ہم

کیسی آزادی ہے یہ، کس کے لیے آزادی
بھوکے رہنے کی، تڑپنے ہی کی آزادی ہے
عام انساں کے مسائل کا نہیں کوئی حل
جس کا دل بھیڑ کے دیکھا وہی فریادی ہے
دل کا وہ خون ہوا ہے کہ دکھا سکتے نہیں
دست و پا ایسے بندھے ہیں کہ ہلا سکتے ہیں
پھر بھی اطراف میں آزادی مشہور ہیں ہم
کتنے مجبور ہیں ہم

جون ۴۹ء

مشاعرے کا خطبۂ صدارت

اے شرابِ سخن کے متوالو!
زلفِ اردو سنوارنے والو!
کس قدر ہوں میں آپ کا مشکور
کیجیے شکریہ مرا منظور
مجھ کو اس بزم کی صدارت دی
یعنی توقیرِ بے نہایت دی
ہوں جہاں ایسے شاعرانِ کرام
جان دیتے ہیں جن پہ خاص و عام
پا گیا جیتے جی ہی جن کا نام
شہرتِ عام اور بقائے دوام
صدر میں کیسے بیٹھوں ان کے حضور
زیب دیتا نہیں مجھے یہ غرور
چاہیے، صدر ہو بڑا قابل
نہ کہ مجھ سا پڑھا لکھا جاہل
ہو کے اس لطفِ خاص پر ممنوں
سب کو خوش آمدید کہتا ہوں
آج کا جو مشاعرہ ہے یہ
جشنِ جموں کا سلسلہ ہے یہ
اور سب کرتے ہیں بہار میں جشن
موسمِ گل میں، لالہ زار میں جشن

ہم خزاں میں بھی جشن کرتے ہیں
وضعِ زندہ دلی پہ مرتے ہیں

اہلِ جموّں ہیں کس قدر خوش باش
مورچے پر بھی رہتے ہیں بشاش
کیوں نہ مستِ طرب ہو ان کا شباب
ہر قدم پر ہے اک دکانِ شراب
حسنِ اردو پہ شیفتہ ہیں یہ
شاعروں پر فریفتہ ہیں یہ
یوں کریں گے غزل کا استقبال
داد سے گونج جائے گا یہ ہال
لیکن اُن سے مری گذارش ہے
ذوق کی سب کے آزمائش ہے
بات ایسی نہ کوئی کہہ جائے
داد، بے داد بن کے رہ جائے
آتے ہیں کس قدر بڑے فنکار
جن کا ہر لفظ زندگی کی بہار
شعر خوانی انھیں مُبارک ہو
میزبانی ہمیں مبارک ہو
شعر خوانی کی ان کو دعوت ہے
بیٹھنے کی مجھے اجازت ہے

۶۵ء کے کچھ بعد

چکور

۲۲ ماترا کے مصرعوں پر مشتمل نظم

رات میں تم نے دیکھی ہو گی ایک چکور
پاگل بن کے اُڑتی تھی جو چاند کی اُور
پریم کا پنچھی تھا کچھ ایسا دیوانہ
اس کے پَروں میں کتنا دَم ہے تھیں جانا
چاند کے مکھڑے سے وہ ہو جاتی ہے بے چین
اس میں کھوئی سی رہتی دِن رَین
سچ مچ ہوتا ہے چاند بہت ہی سُندر
اس کی جوت سے جگمگ ہے جیون ساگر
چاہتی تھی وہ چاند کے اندر کھو جانا
راتوں میں اُوپر کو اڑتی روزانہ
چاند گگن پر اور بہت نیچے تھی چکور
جب وہ اُڑتی، چاند دیکھتا اُس کی اور
چاند کو بھی معلوم تھی اسکی چاہ کی بات
چاہتا تھا وہ اس کے پاس آئے ہر رات
روز چکور اُڑا کرتی لے کر ایک آس
آخر اِک شب پہنچ گئی وہ چاند کے پاس
چاند کو چھو کر سما گئی اس کے اندر
چھا گئی چاند کی جوت اس کے بھیتر باہر

اب اس کے مَن سے پریم نہیں مر سکتا
کوئی دونوں کو الگ نہیں کر سکتا
پیار سے جیون میں بھر جاتا ہے سُکھ چین
گھونٹ بھرا کرتی وہ امرت کے دن رَین
چاند کے اُوپر ہے جو اِک کالا دھبّا
شاید ہے اُس پریم کے پنچھی کی چھایا
چاند چکور ہوئے ہیں ایک سمان
جیسے کایا کے بھیتر رہتا ہے پُران
نہیں یہ ایک پنچھی ہی کی پریم کہانی
گھر گھر میں ہیں پیار کے راجا اور رانی

۶ / مارچ ۴۳ء

نئی اَلف لَیلہ

ہوئی ہے اَلف لیلہ منتشر، بے گھر ہے افسانہ
زبیدہ سر بہ زانو، جعفر و مسرور گم صم ہیں
امیر المومنیں کا جسم بے جاں پارہ پارہ ہے
گری ہے اک مزائل رات اس کی قبر کے اوپر

نہیں بغداد، اب یہ کربلا ہے
یہاں ہر جاگتا سویا ہوا ہے
یہاں کوئی کھنڈر گر سانس لینا چاہتا ہے
تو گھس جاتے ہیں نتھنوں میں فقط بارود کے ذرّے

فرات و دجلہ ہیں دو سیلِ خونیں
اُچھلتا ڈوبتا ہے جن کے اندر
عراقِ پُر تہوّر کا وہ لاشہ
ہیں جس کی پیٹھ میں اپنوں کے خنجر

علاء الدین ابو الشامات! سو جا، بلکہ مر جا
نہیں برسائے گا چھپّر سے اب دینار کوئی
غنیمت جان، گر برسیں نہ سر پر آگ کے گولے
نہیں اُبھرے گی سطحِ بحر سے شہزادیِ گلنار کوئی

کوئی صدام، کوئی ظالمِ مظلوم تازہ الف لیلہ لکھ رہا ہے
نہیں ہیں جس میں پریوں اور شہزادوں کے افسانے
ہزیمت خوردگی کی روئداد اور مرثیے ہیں بس
مبارک مصریوں اور شامیوں کو الف لیلہ کا نیا نسخہ

کتابِ تعزیت کھولے، زبیدہ سر بہ زانو ہے
کھڑے ہیں جعفر و مسرور گم صُم
عراق اب مسکنِ کرب و بلا ہے
غلامِ غرب سارا ایشیا ہے

رُباعیاں

دُنیا میں نہ کچھ بجُز تفکّر پایا
ساغر کو محض دُرد سے پُر پایا
غم کا دن رات سامنا رہتا ہے
راحت کو تصوّر ہی تصوّر پایا

مارچ ۳۹ء

اللہ اللہ رے توانائی میری
عکّاسِ فنا ہے زندگانی میری
تن ہے بے جان اور من ہے بے جوش
ننگِ پیری ہے نوجوانی میری

نومبر ۳۹ء

قدرت کے مناظر میں سما جا اے دل
سیرِ فطرت ہے زندگانی کا حاصِل
ہر برگ سمجھتا ہے تجھے اپنا دوست
ہر پھول پکارتا ہے آ مجھ میں مِل

دسمبر ۴۲ء

اب بھی ترے نام کی کشش باقی ہے
کچھ کچھ وہی پہلی سی روش باقی ہے
گو عشق سے ہاتھ دھو چکا ہے کب کا
پھر بھی دلِ مُردہ میں خلش باقی ہے

نومبر ۴۳ء

پروائے نگاہِ انجمن کس کو ہے!
آفاق میں شہرت کی لگن کس کو ہے!
میرے سر میں بھی ہے بہت کچھ لیکن
اس بزم میں سودائے سخن کس کو ہے!

نومبر ۴۳ء

اے نقشِ دوئی، دل میں قباحت نہ مچا
اے شوق، مجھے تو انگلیوں پر نہ نچا
اِک تازہ حسیں سے مِل گئی ہیں نظریں
یارب! تو مجھے ہوس کے پنجے سے بچا

دسمبر ۴۳ء

گزری ہے عمر مدرسے میں تیسری[1]
کیوں ہوتی نہیں تجھے کُتب سے سیری
آ، چاندنی رات کا سُہانا پن دیکھ
پُرعلم تری کتاب ہے یا میری؟

دسمبر ۴۳ء

سو عیش و نشاطِ زندگی ایک طرف
اِک رُوئے حسیں کی دلکشی ایک طرف

سو ماہ وشوں کی دلبری ایک طرف
یہ نرم سنہری چاندنی ایک طرف

دسمبر ۴۳ء

منہ پھٹ ہے، تجھے فلاح در پیش نہیں
پروائے غیظِ دشمن و خویش نہیں
جو کچھ بھی دل میں آئے، بک دیتا ہے
پچھتائے گا، تو مصلحت اندیش نہیں

دسمبر ۴۳ء

اس وقت کہ آسماں سے اُوپر ہے دماغ
میرا ہر سانس بن گیا موجِ ایاغ
جو عمر شکستہ خاطری میں گذری
مل جائے گا بحرِ جام میں اس کا سُراغ

دسمبر ۴۳ء

کرتا رہتا ہوں گو میں مدحِ ساغر
ہونٹوں کو کبھی نہیں کیا مے سے تر
ہرگز نہ پیوں، سرابِ رنگیں تو رہے
شاید نہ ہو مے خیالِ مے سے بہتر

دسمبر ۴۳ء

دل پر گرے جا رہی ہے تخئیل کی اوس
ہیں رفعتِ لامکاں کے جلوے پابوس
معنی یوں جھلملا رہے ہیں پیہم
بجتا ہو دور دشت میں جیسے کوس

دسمبر ۴۳ء

پھیلی تھی ایک چادرِ خاموشی
ہر ذرّے میں تھا جمود اور بے ہوشی
ایسے طبق فکر سے گزرا ہوں میں
کرتے تھے توریاں جہاں سرگوشی

دسمبر ۱۹۴۳ء

بے کیف و سرور زندگی کرلی ہے
یہ نیند شرابِ ہوش پی کر لی ہے
باقی نہیں اب دل میں کسی کی صورت
جیتے جی میں نے خودکشی کرلی ہے

دسمبر ۱۹۴۳ء

صہبا سی چھلک رہی ہے میرے آگے
چمپا سی مہک رہی ہے میرے آگے
جلووں کی ہر طرف ضیا باری ہے
اوشا سی چمک رہی ہے میرے آگے

دسمبر ۱۹۴۳ء

دل میں ترے ذوقِ عشق پیدا بھی ہو
آتش تری رُوح میں ہویدا بھی ہو
تجھ کو دعویٰ ہے اہلِ دل ہونے کا
پہلے کسی دل ربا پہ شیدا بھی ہو

دسمبر ۱۹۴۳ء

قبلے سے وہ اٹھ رہا ہے بادل ساقی
پل میں ہوا چاہتا ہے جل تھل ساقی

فطرت کا بھی ہوگیا اشارہ اب تو
اب کیا پس و پیش، باغ میں چل ساقی

دسمبر ۴۳ء

یہ رات کا سناٹا، یہ تاروں کا گداز
آتی ہے کدھر سے یہ تڑپتی آواز
پریوں نے کیے اپنے ترانے موقوف
کس نے شبِ ہجر میں سنبھالا ہے ساز

دسمبر ۴۳ء

دھڑکا ہے مجھے، ساتھ ترا چھوٹ نہ جائے
یہ شیشۂ خوش رنگ کہیں پھوٹ نہ جائے
انجام عنایتوں کا محرومی ہے
رُک رُک! مرا لبریز قدح ٹوٹ نہ جائے

دسمبر ۴۳ء

تڑکے جو نسیم سنسناتی آئی
شاید پیغام بلبلوں کا لائی
پھولوں کو مگر، باغ میں فرصت ہے کہاں
وہ تو ہیں محوِ نشۂ رعنائی

دسمبر ۴۳ء

جب شعر کی سرحدوں میں آتا ہوں میں
اپنی محنت سے کھیل جاتا ہوں میں
قیمت تو یہ ہے، قدر شناسی معلوم
بے کار جگر کا خوں جلاتا ہوں میں

دسمبر ۴۳ء

آرامِ خوابِ صبح گاہی چھوڑا
شوقِ تزئین و کج کلاہی چھوڑا
جس روز سے شاعری کے پابند ہوئے
ہم نے تو زیست کا مزا ہی چھوڑا

دسمبر ۴۳ء

کرتا ہے شب و روز تو اوراق سیاہ
غافل، تری پُرگوئی سے اللہ کی پناہ
طعنہ زن و عیب جو ہزاروں ہوں گے
گنتی کے ہوں گے قدرداں لیکن آہ

دسمبر ۴۳ء

اے ہند، نہ پی شرابِ تہذیبِ فرنگ
یہ تیرے مزاج سے نہیں ہم آہنگ
ظاہر میں لطیف ہے، مزے میں کڑوی
خوشبو ہے نہ مستی ہے، فقط ہے خوش رنگ

دسمبر ۴۳ء

تہذیبِ جدید! وہ بھی کیسے دن تھے
جس وقت زمین و آسماں کم سِن تھے
جذبات میں زور، عقل میں سستی تھی
پانی میں، ہوا میں دیوتا ممکن تھے

دسمبر ۴۳ء

جگنو بولا، عاشق مشہور ہے تو
بلبل، مگر، افسوس کہ بے نور ہے تو

بلبل نے کہا، ہوں سوزِ دل سے روشن
تو خاک ہے زندہ، عشق سے دُور ہے تو

دسمبر ۴۳ء

عالم اِک روز پھر درخشاں ہوگا
نور کی سے زیادہ نورِ انساں ہوگا
مصنوعی تہذیب بکھر جائے گی
فطرت کا دُور پھر فروزاں ہوگا

دسمبر ۴۳ء

ایسی دنیا میں چل جو بہلاتی ہو
بُلبل پھولوں کے درمیاں گاتی ہو
پھولی رہے جس جگہ شفق سارے دن
رنگ رنگ کے شمیم حسن برساتی ہو

دسمبر ۴۳ء

اللہ اللہ! یہ زلفِ برہم ساقی
مبہوت ہوا ہے ایک عالم ساقی
ہرگز نہ پیوں گا یہ شرابِ انگور
تو خود ہی شراب سے ہے کیا کم ساقی

دسمبر ۴۳ء

بے حس ہے مرا دل، کوئی بیدل کر دے
آسان ہے زیست، کوئی مشکل کر دے
جس شکل کو دل چھیننے کا دعویٰ ہو
وہ آئے مرے بھرم کو باطل کر دے

دسمبر ۴۳ء

آفاق میں کوئی میرا ہمراز نہیں
آواز سے آشنا، مرا ساز نہیں
خاموش ہوں دیکھ کر زمانے کا رنگ
ایسا نہیں، میرے منہ میں آواز نہیں

دسمبر ۴۳ء

رندوں کو سکون بادہ آشامی میں
زردار کی زندگی ظفر گامی میں
شہرہ ہوا حسن کا زمیں سے تا عرش
شاعر نے پناہ پائی گمنامی میں

دسمبر ۴۳ء

عشرت کی اتنی آرزو، کیا معنی!
لذّت کی اتنی جستجو، کیا معنی؟
دُنیا تنگ و تار سے تری، دوزخ ہے
ہر وقت یہ شور، ہائے و ہو کیا معنی!

دسمبر ۴۳ء

آزادی کی سوجھتی نہیں کچھ تدبیر
کمزور ہوں صرف، ہے یہی اک تقصیر
اس طرح کسی ہوئی ہیں میری مشکیں
اٹھتا ہوں تو سر پہ دیکھتا ہوں شمشیر

دسمبر ۴۳ء

کہتی ہے کچھ ماہِ دو ہفتہ کی نگاہ
ساقی چل جائے آج تو خاطر خواہ

آتے ہیں یہ کون حضرتِ ابشائیل
لا حول ولا قوۃ الّا باللہ

دسمبر ۴۳ء

مغرب کو ہے آرزو، خدا ہو جائے
سیّاروں پہ اُس کا دبدبہ ہو جائے
چندے جو یوں ہی رہا فسادِ تہذیب
ایسا نہ ہو اِک روز فنا ہو جائے

دسمبر ۴۳ء

مسجد سے اذان کی صدا آتی ہے
شاعر کو صبح کی خبر لاتی ہے
افکارِ سماوی کا نزول اب موقوف
دُنیا مرے آستاں پہ چلّاتی ہے

دسمبر ۴۳ء

فردوس کو یا تو نہ بنایا ہوتا
یا پھر زہاد سے چھپایا ہوتا
پھر دیکھتا، کرتے ہیں عبادت کتنے
کِس کِس پہ ترے عَلَم کا سایہ ہوتا

دسمبر ۴۳ء

جاڑے میں جو گھر کے آگیا ہے بادل
رنگ و رونق کو کھا گیا ہے بادل
پھیکا ہے جہاں، سب پہ اداسی طاری
ہر شخص کے دل پہ چھا گیا ہے بادل

دسمبر ۴۳ء

ہو شاد کہ پھر سکوں کا دَور آئے گا
پھر باغ میں سبزہ کسی طور آئے گا
ہاتھوں سے بندھا، بانیِ جَور آئے گا
مایوس نہ ہو آئے گا، اور آئے گا

دسمبر ۴۳ء

پُرہول، جرائم کی گناہوں کی رات
جس میں کھُل کھیلتے ہیں سفلی جذبات
قزاقی، قتل و خون، عصمت ریزی
انسان بنا ہے اشرف المخلوقات

دسمبر ۴۳ء

ہے قید کوئی کہ تھا بہی خواہِ وطن
تقصیر کسی کی مشتبہ چال چلن
انصاف سے اے، حکومتِ جابر کہہ
کیا تجھ سے بڑا ہے کوئی قانون شکن

دسمبر ۴۳ء

کب تک یہ وطن وطن کا رونا، روؤں
ہے مصلحت، اوروں کی طرح جا سوؤں
لیکن عزت کا خون کیوں کر دیکھوں؟
کیونکر یہ متاع آنکھ کے آگے کھوؤں؟

دسمبر ۴۳ء

جب خود کو جواں کہتا ہوں شرم آتی ہے
اور ساتھ ہی لب پہ آہِ نرم آتی ہے
سنسان ہے، سونا ہے مرا ریگستاں
آئے بھی کبھی ہوا، تو گرم آتی ہے۔

دسمبر ۴۳ء

آخر کب تک کیے رہیں دل پہ جبر
ساقی ساقی! نہیں رہا باقی صبر
کس واسطے اتنی دیر کرتا ہے تو
وہ ڈھک گیا آفتاب، وہ آیا ابر

دسمبر ۴۳ء

گر سال میں اک بار نکلتے تارے
اس وقت وہ ہر آنکھ کے ہوتے پیارے
اک سال تک انتظار کرنے کے بعد
سب دیکھتے رات بھر، خوشی کے مارے

دسمبر ۴۳ء

منصب کا بھرم، نہ مصلحت کا بندھن
دنیا کا غم، نہ عاشقی کی الجھن
بس کھاؤ پیو، کھیلو اور موج کرو
ہے عمر کا بہترین حصہ بچپن

دسمبر ۴۳ء

گر سوچ ہو آسماں کے اوپر کو رواں
کب تک ہوگا خلا، کہ ہستی کا نشاں؟
حد بھی ہے محال، بے حدی بھی ہے محال
دیوانہ کیے دیتا ہے یہ سرِ مکاں

دسمبر ۴۳ء

سینوں میں خلوص کا اجالا کر دیں
دوزخ کو بہشت کا نوالا کر دیں

ظلمات سے کھینچ لائیں آبِ حیواں
اِک اور خدا کا بول بالا کر دیں

دسمبر ۴۳ء

آ جوشش و خروشِ زندگانی تو دیکھ
اے مُردہ نفَس! سوزِ جوانی تو دیکھ
شاید مِل جائے اس سے تحریک تجھے
مستوں کی طبیعت کی روانی تو دیکھ

دسمبر ۴۳ء

منعم، ترے جذبات ہیں مانندِ برف
نادار کو دیتا نہیں تو کچھ، کم ظرف
تیری عشرت، اوروں کی محرومی
تیری دولت پہ اور تجھ پر دو حرف

دسمبر ۴۳ء

اس دوست کی تصویر کو جب دیکھتا ہوں
گزرے، پُرشوق روز و شب دیکھتا ہوں
آجاتی ہے کون کون سی دُنیا یاد
دھو لیتا ہوں آنکھ اشک سے تب دیکھتا ہوں

دسمبر ۴۳ء

خاموش ہے شب، نور کا تڑکا ہے دُور
سُونے ہیں اندھیرے آشیانوں میں طیور
تارے، ہیں ٹکٹکی لگائے لیکن
ان کی آنکھیں بھی نیند سے، ہیں مخمور

دسمبر ۴۳ء

فطرت تجھ کو بلاتی ہے، باہر دیکھ
تڑکے کی سنہری دھوپ کا منظر دیکھ
دیتی ہے خنک شمیم تجھ کو دعوت
اے جاگے ہوئے، چھوڑ بھی دے بستر دیکھ

دسمبر ۴۳ء

اللہ اللہ یہ تیرے موئے تہہ دار
یہ خم، یہ چمک، یہ فرقِ روشن کی بہار
اک بار ترے پاؤں پہ آنکھیں رکھ دوں
بعد اس کے ٹھہر جائے زماں کی رفتار

دسمبر ۴۳ء

یہ حسن سے تر موئے پریشاں تو دیکھ
اس بے دُھلے چہرے کی بہاراں تو دیکھ
آتا ہے وہ سیدھا خواب گہہ سے اُٹھ کر
یہ نیند بھری چشمِ غزالاں تو دیکھ

دسمبر ۴۳ء

یہ عشق نہیں ہے، ایک وحشت ہے محض
اقبالِ شکست ہے، ہزیمت ہے محض
کھنچ جانا کسی کی سمت، کمزوریِ دل
مفتوح کا اعترافِ طاعت ہے محض

جنوری ۴۴ء

پیمانۂ مے ہی میں نہیں ہوتا سرور
ہر شخص کو رہتا ہے کوئی نشہ ضرور

دولت، حسن، اقتدار سب میں ہے نشہ
ہے کوئی کمالِ علم و فن پر مغرور

جنوری ۴۴ء

ہے شیخ میں کیا وصف جو کافر میں نہیں
اس کا سا خُلق، شیخ طاہر میں نہیں
لیکن جو سکونِ قلب کی دولت ہے
وہ مالِ گراں نصیبِ منکر میں نہیں

جنوری ۴۴ء

ملّت کے سبب کوئی وطن کا دشمن
منصب کے لیے کوئی غلامِ لندن
مزدور کی آڑ میں کوئی غیر پرست
افسوس ہے اے نمک حرامانِ وطن

جنوری ۴۴ء

نقاد کو میری شاعری سے ضد ہے
حاکم کا خیال ہے کہ یہ مفسد ہے
ہندو کو ملال ہے، یہ ہاتھوں سے گیا
ملّا کو جلال ہے کہ یہ ملحد ہے

جنوری ۴۴ء

دل میں جو آئے، کہنے کی جرأت رکھ
کیا خوف کسی کا، لگی لپٹی مت رکھ
مفلوج اگر ہے تیرا بازوئے عمل
گفتار میں تو جسارت و ہمت رکھ

جنوری ۴۴ء

تو ہے قدرت کی سرنوشتوں سے بلند
پرواز کو اپنی رکھ بہشتوں سے بلند
انسانِ گناہ گار و بافسق و فجور!
تو اب بھی ہے مقلوعِ فرشتوں سے بلند

جنوری ۴۴ء

دیتی ہے دل کو جذبۂ تخلیقی
کر دیتی ہے ختم عقل کی زندیقی
لے جاتی ہے رُوح کو وطن میں اس کے
افسونِ فلک مقام ہے موسیقی

جنوری ۴۴ء

اے روحِ سرود، کون سا تھا وہ جہاں
دم بھر کو ہوا تھا جو نگاہوں پہ عیاں
تھا کتنا لطیف و پُرسکوں وہ خطّہ
میں پہنچا جہاں بہ دقتِ افتاں خیزاں

جنوری ۴۴ء

کیا لقمۂ تر میں ذائقہ ہے کوئی
جب سامنے گرسنہ کھڑا ہے کوئی
کس طرح تو کر رہا ہے خوابِ شیریں
نزدیک ترے کراہتا ہے کوئی

جنوری ۴۴ء

جی آرزوؤں سے بھر گیا ہے غافل
سیلابِ ہوس اتر گیا ہے غافل

جس دَورِ حیات کے لوازم تھے یہ
وہ دَور ہی اب گزر گیا ہے عاقل

جنوری ۴۴ء

جی چاہتا ہے کھائے کوئی سخت گزند
سیلابِ ہوس نے کر دیا ہے دم بند
پھرتا ہوں لیے ہوئے ہتھیلی پر دل
شاید کوئی اس خزَف کو بھی کرے پسند

جنوری ۴۴ء

تو دیکھ لے خود مجھ کو، جنوں ہے کہ نہیں؟
میرے دلِ افسُردہ میں خوں ہے کہ نہیں؟
قسّام! ترے خزانۂ بے حد میں
شاعر کے بھی نام کا سکوں ہے کہ نہیں؟

جنوری ۴۴ء

پگھلاتا ہوں اپنے مغز کو صبح و شام
تب پاتے ہیں چند مصرعِ ترانجام
پھر کوئی بڑا صلہ نہیں مانگتا ہوں
بس اتنا کہ بد میں نہ سنائے دُشنام

جنوری ۴۴ء

کِس طرح نظریۂ ہیچ مبیں، کر لوں مَیں
سجدے میں فرو، اپنی جبیں کر لوں مَیں
پہلے تو مجھے عقلِ مشکِّک دے دی
پھر کہتا ہے، بے سوچے یقیں کر لوں میں

جنوری ۴۴ء

اے رات مجھے تجھ سے محبت ہے بہت
تجھ سے تنِ واماندہ کو راحت ہے بہت
دن بھر ترے انتظار میں کٹتا ہے
سائے میں ترے فکر کو فرصت ہے بہت

جنوری ۴۴ء

میں آیا ہوں آسمان کے اُوپر سے
واقف ہوں لامکان کے منظر سے
میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے دُنیا
مَیں بھاگتا جا رہا ہوں اسکے ڈر سے

جنوری ۴۴ء

یہ برف کی نرم تہہ، یہ جبروتی کوہ
سر میں افکار کا ہو جیسے انبوہ
بادل بھی ہیں مجھ سے نیچے، کہرے کی طرح
کیسی نیچائی پر ہے انساں کا گروہ

جنوری ۴۴ء

تقدیر نے اپنے مرتباں کو کھولا
اِک تلخ سفوف اس کے اندر گھولا
اِک جام بڑھایا عشق کے ہونٹوں تک
وہ پی گیا، ہائے کس قدر تھا بھولا

جنوری ۴۴ء

کیا تجھ کو نہیں ملال اے بندرگاہ
جاتا ہے کوئی چھوڑ کر تیری پناہ

ہاں لنگر اُٹھاؤ، کھول دو کشتی کو
ہے میری جاں کو اپنی منزلِ کی چاہ

جنوری ۴۴ء

پہ چنگالِ شہنشہی کا حربہ ہو شعر!
تو کتنا ذلیل ہو گیا ہے او شعر!
وہ ایک ہوس ناک کی مرضی پہ چلے
تھا بارگہہِ حُسن کا تحفہ جو شعر

جنوری ۴۴ء

یارب اِک بندۂ گنہ گار ہوں میں
واجب ہے اگر ذلیل اور خوار ہوں میں
انجام سے زندگی کے اتنی غفلت
دوزخ سے بھی بدتر کا سزاوار ہوں مَیں

جنوری ۴۴ء

اے حسن لبِ بام کے پروانے، سُن
اے شغلِ مے و جام کے دیوانے، سُن
مُطرب کی الاپ پر بہت سر کو دُھنا
بربادیِ قوم کے اب افسانے سُن

جنوری ۴۴ء

مجھ کو مِرے مَن کی موج میں بہنے دے
دُنیا جو کچھ کہے، اسے کہنے دے
گل تو نہ تہذیب مُبارک تجھ کو
آسودۂ ناک ہی مجھے رہنے دے

جنوری ۴۴ء

جو پاس ترے ہے، آہ وہ بھی ہے کوئی
جو دیکھے تجھے، نگاہ وہ بھی ہے کوئی
رہتا ہے جہاں ترا اُجالا دن رات
کونین میں جلوہ گاہ، وہ بھی ہے کوئی

جنوری ۴۴ء

اے شخص ترے دھیان مری ہیئت پر
ہوتا ہے لباس ایک دھوکا اکثر
گر تجھ کو ملی ہو چشمِ بینا تو دیکھ
کیا کیا ہیں مری ذات کے اندر جوہر

جنوری ۴۴ء

مرمر کا مجسمہ ہے کتنا ذی نشان
ہیئت سے عیاں جمالیاتِ یونان
آنکھوں کی کشیدگی میں جذبات لیے
بہتے ہوئے دامن میں سمیٹے رومان

جنوری ۴۴ء

اللہ رے یہ صنم پرستِ مکار
دیں دار بنا ہوا ہے یہ دُنیا دار
یہ زعم، یہ پندار، یہ خردہ گیری
گویا اسے ہو چکا ہو رب کا دیدار

جنوری ۴۴ء

اے صاحبِ زر، تجھ کو نہیں آتی شرم
تیرے نیچے ہے بسترِ نرم و گرم

سردی میں ٹھٹھرتے جاگتے ہوں گے وہ
جو رکھتے ہیں تیرے جسم کو تازہ و ترم

جنوری ۴۴ء

مائل بہ فنا جمالِ انسانی ہے
یہ حُسن ہے یا برق کی تابانی ہے
رہتا ہے شبابِ یار تک جوشِ عشق
افسوس یہ ایک جذبۂ فانی ہے

فروری ۴۴ء

مل بیٹھتے ہیں جب مرے ساتھی باہم
ہنس ہنس کے اڑا دیتے ہیں دُنیا کا غم
سب محوِ طرب ہیں اور مجھے ہے یہ خوف
یہ صحبت ہو نہ جائے درہم برہم

فروری ۴۴ء

ذلّت کے باوجود جینا بے کار
غصّے میں لہو کے گھونٹ پینا بے کار
اِک بار مسک جائے تو پھر مشکل ہے
عزّت کی قبائے چاک سینا بے کار

فروری ۴۴ء

بے ساختہ روز آنکھ لڑ جاتی ہے
اس چہرے پر نگاہ گڑ جاتی ہے
وہ ہنستا ہے، نہال ہو جاتا ہوں
بولے تو دل میں جان پڑ جاتی ہے

فروری ۴۴ء

اے حسنِ ملیح مجھ سے ہنس ہنس کے نہ بول
سینے میں مرے جنون کا باب نہ کھول
تو میری طرف جو دیکھ لیتا ہے کبھی
ہونے لگتے ہیں دو جہاں ڈانواڈول

فروری ۴۴ء

دیدار ترا، کتنی سعادت ہے یہ
گفتار ہے یا صباحِ جنت ہے یہ
تیرے لیے ملنا کس قدر آساں ہے
میرے لیے کتنی بڑی دولت ہے یہ

فروری ۴۴ء

ہے اس شاعر کی ذات کتنی ملعون
کرتا ہے غزل میں عشقِ بے لوث کا خون
اس کے کعبے میں ہیں بہت سے اصنام
ہے پردۂ عشق میں ہوس کا مضمون

فروری ۴۴ء

غافل یوں تو عاشقِ ہرجائی ہے
اِک دو کا نہیں، کئی کا سودائی ہے
پھر بھی ہے کلام میں بلا کی گرمی
ریگستاں سے سمومِ گرم آئی ہے

فروری ۴۴ء

کچھ وحشی کمان و تیر سے لڑتے ہیں
کف منہ میں ہے، جوش سے گرے پڑتے ہیں

اے مردِ خدا، تو نے انھیں پہچانا؟
یہ دشمن ہے، بات بات پر اُٹھتے ہیں

مارچ ۴۴ء

نخوت سے مذاہب کو اکڑ لینے دو
آپس میں ذرا دیر جھگڑ لینے دو
بیٹھے رہو خاموش، بلا مول نہ لو
انسان کو قید میں جکڑ لینے دو

مارچ ۴۴ء

اس بادۂ گُل رنگ سے بھر میرا جام
جو بادۂ گُل رنگ ہے زاہد کو حرام
غرقِ مے کر دے مصلحت بینی کو
کھلم کھلا نشاط کا دامن تھام

مارچ ۴۴ء

یُوں آتی ہے ریل کی مُسلسل آواز
بجتا ہو سکوتِ شب میں جیسے اِک ساز
بڑھ کر گھٹتی ہے اور گھٹ کر بڑھتی
رفتارِ حیات کا لیے ہے انداز

مارچ ۴۴ء

ساقی تو ہماری سمت سے آنکھ نہ موڑ
گن گن کے نہ دے جام، قلبِ نازک کو نہ توڑ
وہ دیکھ، چھلک کے گر گئی کپڑوں پر
مینا کو زمیں پہ رکھ دے، دامن کو نچوڑ

مارچ ۴۴ء

تیار کھڑے ہوئے ہیں بادل تہہ دار
ہونے کو ہے، ہونے کو ہے دم میں بوچھار
ہے رعد کی تان نامکمل ساقی
شامل ہو جائے ساغروں کی جھنکار

اپریل ۴۴ء

اے دل کتنا سہانا لگتا ہے چاند
یک بارگی جست کر، فضاؤں کو پھاند
آتا ہے مجھے خیال اک چہرے کا
یہ کیا ہوا، چاند پڑ گیا فوراً ماند

اپریل ۴۴ء

دُنیا میں عجب سُرخ بلا آئی ہے
ہر ملک پہ جنگ کی گھٹا چھائی ہے
غیرت کا مقام ہے جوانِ ہندی
ایسے میں تجھے فکرِ خود آرائی ہے

اپریل ۴۴ء

سوتا ہے شہرِ جمال میرے آگے
فردوس ہے پائمال میرے آگے
اپنے محور پہ رُک گئی ہے، دُنیا
ہے رُوحِ زماں نڈھال میرے آگے

اگست ۴۴ء

یہ کون کھڑا ہے خون کا جام لیے
صد موجِ غرور آنکھوں میں بند کیے

اس ہاتھ میں ہے کتاب، اِس میں تلوار
زنبیل میں دوزخ اور فردوس لیے

ستمبر ۴۴ء

اے شخص جو تو غیور و خوددار نہیں
واللہ تو جینے کا سزاوار نہیں
یہ مشربِ صلحِ کُل ہے یا نامَردی؟
دشمن کی خوشامد سے تجھے عار نہیں

اکتوبر ۴۴ء

ماتم بھی یہیں ہے اور عشرت بھی یہیں
حسرت بھی یہیں ہے اور فرحت بھی یہیں
سچ یہ ہے کہ مقسوم ہے اپنا اپنا
دوزخ بھی یہیں ہے اور جنت بھی یہیں ہے

اکتوبر ۴۴ء

ذرّوں میں سرور ہے ترے آنے سے
رحمت کا ظہور ہے ترے آنے سے
جو گھر کہ سیاہ خانہ کہلاتا تھا
اب نور ہی نور ہے ترے آنے سے

اکتوبر ۴۴ء

شیشے میں شرابِ ناب آئے جیسے
اِٹھلاتا ہُوا شباب آئے جیسے
یہ کون مرے الم کدے میں آیا؟
ظلمات میں آفتاب آئے جیسے

اکتوبر ۴۴ء

تنہائی ہے اور ایک اندھیرا گھر ہے
دن میں بھی شبِ گور کا سا منظر ہے
کاٹے کھاتے ہیں اس کے دیوار و در
یہ گھر تو جہنم سے بھی کچھ بدتر ہے

ستمبر ۴۴ء

اِک عمر سے دامانِ نظر خالی ہے
دل سُونا ہے، مہمان سے گھر خالی ہے
کیا پوچھتے ہو میرے خرابات کا رنگ
اِک جام ضرور ہے، مگر خالی ہے

ستمبر ۴۴ء

صحراؤں کے درمیاں لیے پھرتی ہے
تقدیر کہاں کہاں لیے پھرتی ہے
گو آبِ حیات پر بھی قادر ہے یہ
لیکن تشنہ دہاں لیے پھرتی ہے

ستمبر ۴۴ء

اِس سے خلشِ دردِ جگر کون کہے
بے رَونقیِ دیدۂ تر کون کہے
ہمت نہیں، موقع نہیں، ورنہ دل میں
ارمان تو کیا کیا ہیں مگر کون کہے

ستمبر ۴۴ء

اِک جام میں آبِ دَمِ خنجر لاؤ
کر کے سیّال تیغ کا جوہر لاؤ

اف رے سردی، برف جمی ہے دل پر
جو حلق کو چیر دے وہ ساغر لاؤ

ستمبر ۴۴ء

بہتی ہوئی نہرِ زندگی ہو جیسے
ساغر کے کنارے مے لگی ہو جیسے
اے کاش میں چوم سکتا اس کے لب کو
لالے کی نرم پنکھڑی ہو جیسے

ستمبر ۴۴ء

دوروزہ عروج کا بھروسا کیا ہے؟
انسان، خوش اعتبار بھی کیا کیا ہے
کیا جانیے کس وقت دغا دے جائے
برسات کی دھوپ ہے، یہ دُنیا کیا ہے

اکتوبر ۴۴ء

دوزخ کا ذرا ذکر اگر آتا ہے
ان کو ملکُ الموت نظر آتا ہے
جس وقت یہ نام لیتے ہیں جنّت کا
زہّاد کے مُنہ میں پانی بھر آتا ہے

اکتوبر ۴۴ء

اِک حُور، بہت دُور کہیں، گاتی ہے
شبنم مستی سے غش ہوئی جاتی ہے
یاد آنے لگیں کِسی کی وحشی آنکھیں
ہٹ جاؤ یہاں سے مجھے نیند آتی ہے

اکتوبر ۴۴ء

یہ سرد ہوا، یہ ریت، یہ ساحلِ بحر
بیدار ہے اور مضطرب ہے دلِ بحر
یہ بھیگی ہوئی رات، یہ اڑتے ہوئے جھاگ
احساسِ لطیف و سرور ہے حاصلِ بحر

اکتوبر ۴۴ء

اِک جوگی ملہار گا رہا ہے، گائے
بادل ہر سمت چھا رہا ہے، چھائے
اوروں کی کھکھیڑ سے مجھے کیا مطلب
کوئی مرے دل میں آرہا ہے، آئے

اکتوبر ۴۴ء

کیا ہو گئی اب سَیف زبانی میری
مفقود ہے کیوں سحر بیانی میری
کیا ہو گیا جذبات کی طغیانی کو
خالی ہے اثر سے کیوں کہانی میری

نومبر ۴۴ء

الفت سے تری کُل انجمن ہے سرشار
کچھ گُل ہی نہیں، سارا چمن ہے سرشار
اور مَیں نے تو جس وقت تجھے دیکھا تھا
اس وقت سے ہر موئے بدن ہے سرشار

نومبر ۴۴ء

دَم گھُٹنے لگا ہے کربِ روحانی سے
کٹتی ہے عمر کس پریشانی سے

کوئی بھی نہیں خلوص پیشہ اس میں
نفرت ہے مجھے جہانِ انسانی سے

نومبر ۴۴ء

تنہائی کے اوہام نے گھیرا ہوگا
ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا
چلتے ہی رہیں گے دم میں دم ہے جب تک
جنگل میں کہیں رَین بسیرا ہوگا

نومبر ۴۴ء

اِک ناؤ بنائیں برگ ہائے گُل کی
اک جوئے رواں بہائیں عطرِ مُل کی
دن رات چلے جائیں کسی کے ہمراہ
چلنے میں صدا آیا کرے قُلقُل کی

نومبر ۴۴ء

جس بزم پہ، جس رُخ پہ نظر جاتی ہے
تہذیب ہی تہذیب نظر آتی ہے
آرائشِ جسم کا ہے سامان بہت
معلوم نہیں رُوح بھی کچھ پاتی ہے؟

نومبر ۴۴ء

جو صورتِ نوجواں نظر آتی ہے
تہذیب عجب شان سے لہراتی ہے
یہ جامۂ زرق برق سُبحان اللہ!
آنکھوں میں چکاچوند ہوئی جاتی ہے

نومبر ۴۴ء

ہے آج دماغ آسماں پر میرا
نشّے کا دھواں دیتا ہے ساغر میرا
وہ آج مرے ساتھ رہا سارا دِن
پھر جائے نہ کیوں غرور سے سر میرا

دسمبر ۴۴ء

ہے رنگ یہی تو زندگی مشکل ہے
جینا ہے کئی سال، بڑی مشکل ہے
یہ ٹھوکریں، یہ مصیبتیں، یہ ذلّت
کیا کیجیے ہائے خودکشی مشکل ہے

دسمبر ۴۴ء

کچھ ایسا بدل گیا زمانے کا ڈھنگ
اچھے اچھے بھول گئے اپنی ترنگ
اب چین کی بانسری نہیں بج سکتی
رچ بس گئی ہے فضائے عالم میں جنگ

دسمبر ۴۴ء

کیا دیر ہوئی صراحی آتے آتے
سب مغ بچے تھک گئے ہیں گاتے گاتے
ایں یہ کیا؟ تو ابھی یہیں ہے ساقی
تو نے تو بھور کر دی جاتے جاتے

دسمبر ۴۴ء

جس وقت زمیں پہ چاندنی آتی ہے
فطرت کی سنہری زلف کھل جاتی ہے

گاتا ہے جبھی رفیق نغمے کوئی
کونین پہ ایک نیند چھا جاتی ہے

دسمبر ۴۴ء

ظلمت کی جبیں سے گرد دھل جاتی ہے
فطرت کی سنہری زُلف کھُل جاتی ہے
یہ چاندنی چاندنی نہیں ہے غافل
تاریکیِ شب میں صُبح گھُل جاتی ہے

دسمبر ۴۴ء

سردی سے خیالات جمے جاتے ہیں
افکار کے طبقات جمے جاتے ہیں
بجتے ہیں دانت اور گلا بیٹھا ہے
کیا بولیے فقرات جمے جاتے ہیں

دسمبر ۴۴ء

میں کیسے رہوں مستِ محبّت اے دوست
اِک جان کو ہیں لاکھ مصیبت اے دوست
خوابوں کے شفق زار سے جانا ہوگا
یہ زیست ہے اِک تلخ حقیقت اے دوست

دسمبر ۴۴ء

یہ نشۂ عاشقی بھلانا ہوگا
آخر غمِ روزگار کھانا ہوگا
کچھ دیر کو گر فرار کر بھی جاؤ
پھر لوٹ کے اس جہاں میں آنا ہوگا

دسمبر ۴۴ء

دُنیا گلشن نہیں، بیاباں ہے یہ
جبراً آنا پڑا ہے، زنداں ہے یہ
کچھ اپنی پسند سے نہیں جیتے ہم
جیتے ہیں کہ خودکشی سے آساں ہے یہ

دسمبر ۴۴ء

ہر دل میں ہجومِ بغض و کینہ پایا
ہر آنکھ کو مکر کا دفینہ پایا
اس کے پاسنگ بھی نہیں دام و دَد
انسان کو کس قدر کمینہ پایا

دسمبر ۴۴ء

آنکھوں میں رہے گا خوابِ غفلت کب تک
کب تک؟ یہ نشۂ فلاکت کب تک؟
طوفان میں آؤ، ہاتھ پاؤں مارو
آخر یہ جمود، یہ نحوست کب تک؟

دسمبر ۴۴ء

جاڑوں میں چاندنی کھلی ہے بے کار
یہ نعمت دھرتی کو ملی ہے بے کار
سوتے ہیں گھروں میں سب، اسے دیکھے کون؟
اے چاند تری دریادلی ہے بے کار

دسمبر ۴۴ء

اُف اس مئے کش کا تمتماتا چہرہ
اُبلی ہوئی آنکھیں، جوش کھاتا چہرہ

گردشِ آنکھوں کی کس قدر ہیبت ناک[1]
ابلیس کا ارژنگ دکھاتا چہرہ

دسمبر ۴۴ء

بحران میں سے گزر رہی ہے دُنیا
اِک پُل کو عبُور کر رہی ہے دُنیا
معلوم نہیں نیا جنم کیسا ہو
دَم توڑ رہی ہے، مر رہی ہے دنیا

دسمبر ۴۴ء

اہلِ شر کو سراہتی ہے دُنیا
نااہلوں کی خیر چاہتی ہے دُنیا
جب دینی پڑے کسی سزاوار کو داد
گویا دب کر کراہتی ہے دُنیا

دسمبر ۴۴ء

معلوم نہیں کیا ہوا مِرا مُستقبل
ہے، یا نہیں؟ بخت میرے اُوپر مائل؟
اٹھنا ہے ابھی کہ خاک پر گرنا ہے؟
کِس گھپ اندھیرے میں ہے میری منزل!

دسمبر ۴۴ء

انجانے اندھیرے میں چلا جاتا ہوں
ٹھوکر کھاتا ہوں، لڑکھڑا جاتا ہوں

---

[1] فراق صاحب کو دیکھ کر۔

نزدیک افق کے، ٹمٹماتا ہے کچھ
بے ساختہ اس طرف کھنچا جاتا ہوں

دسمبر ۴۴ء

دیتا ہے کوئی فریب، کھاتا ہوں مَیں
کیا بوالعجبی ہے، لطف پاتا ہوں میں
ہے ایک سراب مہربانی اس کی
اس راز کو دل سے بھی چھپاتا ہوں میں

دسمبر ۴۴ء

کہتے ہیں، کہیں کوئی جہاں ایسا ہے
دریاؤں کا پانی بھی جہاں مے سا ہے
کیوں چل کے وہیں نہ رہنے لگیے اے دوست
یہ کہنہ مکاں تو خاکداں جیسا ہے

دسمبر ۴۴ء

کیا بات کہ اس شراب میں جھاگ نہیں
پیری کی طرح خنک ہے، یہ آگ نہیں
افسردہ و مُردہ و خموش و بے جوش
یہ جام ہے وہ بزم، جہاں راگ نہیں

دسمبر ۴۴ء

احساس کا طغیان اٹھا ہے دل میں
جذبات کا ہیجان ہوا ہے دل میں
کچھ بات ہے جو زبان رہتی ہے بند
طوفان سا طوفان بھرا ہے دل میں

جنوری ۴۵ء

وہ میرے غریب خانے میں آئے تھے
جنّت سے کسی نے پھُول برسائے تھے
میری باتوں میں شوق کی بُو جا کر
کس لُطف سے، کس ادا سے شرمائے تھے

جنوری ۵۴ء

اس لہجۂ شیریں کا مزا کیا کہیے
الفاظ کا انداز، ادا کیا کہیے
آواز پہ اس کی ٹوٹ جاتا ہے دِل
چلتی ہے بہشت کی ہَوا کیا کہیے

جنوری ۵۴ء

تقدیر بھٹک رہی ہے ان آنکھوں میں
ناکامی جھلک رہی ہے ان آنکھوں میں
آبِ حیواں سے بھی نہیں بجھنے کی
وہ پیاس بھڑک رہی ہے ان آنکھوں میں

جنوری ۵۴ء

دن میں تو بہت یاد نہیں آتا ہے
پر رات کو وہ عجب ستم ڈھاتا ہے
جب نیند کے درمیان کھُلتی ہے آنکھ
دل اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے

جنوری ۵۴ء

دابے دیتا ہے تلخیوں کا انبار
ممکن نہیں سانحاتِ عالم سے مزار

غدّار ہے وہ جو رنگ رلیاں ڈھونڈے
جو عشق کا نام لے ، لگا دو تلوار

جنوری ۵۴ء

ذیل کی پانچ رباعیاں میری ماں
کے انتقال پر کہی گئیں

یہ کون فرشتے کی طرح لیٹا ہے
اس کے لیے بامِ عرش کا زینا ہے
بے فکرِ جہاں، سفید چادر اوڑھے
کس گہرے سکون کے مزے لیتا ہے

جنوری ۵۴ء

اے بھائی مرے، تو کس طرح کہتا ہے
"یہ جسم ہے سرد، اس میں رکھا کیا ہے؟"
وہ بولتی ہنستی چلتی پھرتی ہستی
میں کیسے یقین کر لوں اب مُردہ ہے

جون ۵۴ء

اب میری حیات جگمگائے گا کون؟
ہم راہ مرے، راہ دکھائے گا کون؟
تاریک پڑا ہے زندگی کا جنگل
جادے میں مرے، شمع جلائے گا کون؟

جون ۵۴ء

اِک سایہ تھا سر پہ، ہٹ گیا ہے وہ بھی
اِک رشتہ بچا تھا، کٹ گیا ہے وہ بھی

جس ساغرِ زندگی کا قطرہ تھا میں
کس طرح کہوں الٹ گیا ہے وہ بھی

جون ۵۴ء

وہ مادرِ مہربان و مشفق ہے کہاں؟
خالی ہے محبّت سے یہ سنسان جہاں
صد شکر ابھی ظلِ پدر باقی ہے
ورنہ مشکل تھا سانس لینا بھی یہاں

جون ۵۴ء

بے شوق گزر جائے جوانی میری
افسوس یہ خشک زندگانی میری
رفتار میں ہے اگر یہی اضمحلال
بہتر ہے کہ رُک جائے روانی میری

نومبر ۵۴ء

مدّت میں ریاضِ شعر میں آتا ہوں
راگوں کے ذریعے پھول برساتا ہوں
ہر لفظ میں جن کے سرِّ آدم ہے نہاں
وہ فکر بھری رباعیاں گاتا ہوں

نومبر ۵۴ء

کونین میں جیسے انقلاب آتا ہے
جزر و مد کی طرح شباب آتا ہے
ہو جاتی ہے احساس سے فطرت معمور
ہر آہ کا تاروں سے جواب آتا ہے

نومبر ۵۴ء

وہ دن گئے، جب مار گزیدہ تھا دل
اب آبِ حیات کے قریں ہے منزل
بیٹھا ہے جمود، سر بہ زانو غم میں
اب شعلہ و برق ہو گیا ہے غافل

دسمبر ۴۵ء

بڑھتی جاتی ہے خواہشوں کی مقدار
کتنی دلکش ہیں، کس قدر ہیں دشوار
معلوم نہیں کیسے مستقبل کی
میرے لیے گل برگ لیے ہے یا خار

فروری ۴۶ء

عالم میں بھڑک رہی ہے زوروں سے آگ
تقدیر کے منہ پہ آئے ہیں خونیں جھاگ
اے نغمۂ عشق گانے والے شاعر
میں کہتا ہوں، بند کر یہ بے وقت کا راگ

فروری ۴۶ء

منڈلاتی ہے، گرتی ہے، جھپٹتی ہے موت
کیوں میرے ہی دامن سے لپٹتی ہے موت
اے میرے غرور، اے مرے سر کی ہوا
دیکھیں، تجھ سے کیسے نپٹتی ہے موت

فروری ۴۶ء

میری ہمت ہے آسمانوں سے بلند
جل جاتی ہے میرے آگے جابر کی کمند

مذہب ہو کہ انسان کا قانون، کہ حکم
آزاد بھی ہوتے ہیں کسی کے پابند

مارچ ۴۶ء

اے چاند بلا لے مجھے اندر
اے چاند، مرے دل میں بنا اپنا گھر
شاعر کے خیال کو بھی جگمگ کر دے
عالم پہ لنڈھا رہا ہے اپنا ساغر

مارچ ۴۶ء

یہ چاندنی رات، یہ ہوا کے جھونکے
سوئے ہوئے جذبات زمیں کے جھونکے
انگڑائی لی اور اُٹھ گئے آج کی رات
وہ ذرّے، جو تھے سوئے ہوئے برسوں سے

اپریل ۴۶ء

سوتے ہوئے دریا کو جگایا کس نے؟
خاموش شگوفوں کو ہنسایا کس نے؟
کون آیا کہ خوشبوؤں کے سوتے پھوٹے؟
پھولوں کے دلوں کو گدگدایا کس نے؟

جولائی ۴۶ء

یہ کالے نقاب میں گناہوں کی رات
مجبور طوائفوں کی آہوں کی رات
عصمت کا کھیل کس قدر ہوتا ہے؟
دولت مندوں کی، روسیاہوں کی رات

نومبر ۴۶ء

خوابوں کی مرے حسین دُنیا ہے تو
تخئیل کا بہترین نقشہ ہے تو
دُنیا میں ترے دَم سے وفا باقی ہے
انساں نہیں، معصوم فرشتہ ہے تو

جنوری ۴۷ء

فردوس کی نو بہار ہے تیرے لیے
حوروں کا دل زار ہے تیرے لیے
وہ کون ہے جو تیرا پرستار نہیں
خالق خود بے قرار ہے تیرے لیے

جنوری ۴۷ء

تاریکیاں چیر کر چمکتی ہے حیات
ویران فضاؤں میں مہکتی ہے حیات
ہر شے میں جوانی کا نکھار آیا ہے
اے دوست ترے دم سے مہکتی ہے حیات

اگست ۴۸ء

ہو جیسے بیابان کی تنہائی کی رات
سنسان پڑی ہوئی تھی شاعر کی حیات
اک بار یہ کس چاند سے کرنیں پھوٹیں
جگمگ جگمگ چمک گئے سب ذرّات

اگست ۴۸ء

شہرت کی اپسرا سے منہ موڑ کے بیٹھ
گٹ بندی کا جکڑ بیوہ توڑ کے بیٹھ

جیسے تپتی ٹین پہ اُچھلے بلّی
کیوں بھاگتا پھرتا ہے، ہوس چھوڑ کے بیٹھ

جنوری ۸۰ء

شہرت کی چاہ اِک قفس ہے یارو
جو خود سے مِل جائے وہ بس ہے یارو
تحسین کے دو ٹکڑے، مناصب، ایوارڈ
سب کچھ دھوکا ہے، سب ہوس ہے یارو

جنوری ۸۰ء

پھنستے ہیں کیسے کیسے شاطر بندے
ہو جاتے ہیں صاف ہاتھ کتنے گندے
اُردو کے بورڈ، اکادمی، انجمنیں
کیا خوب حکومت نے بنائے پھندے

جنوری ۸۰ء

اے علم کے پاسبان، عیّاری چھوڑ
دانش گاہوں میں تو ریاکاری چھوڑ
جب فیصلہ کرنا ہو، دیانت سے کر
للّٰہ گروہ کی وفاداری چھوڑ

جنوری ۸۰ء

وجدان کی بارگہ میں جب آتا ہوں
ہستی کی گتھیوں کو سلجھاتا ہوں
تشکیک سے جب معانقہ ہوتا ہے
سلجھے ہوئے مسئلوں کو اُلجھاتا ہوں

جولائی ۹۰ء